الرسالہ

Al-Risāla

January 2001 • No. 290 • Rs. 10

اگر آدمی کچھ نہ جانے تو کم سے کم اسے اپنے نہ جاننے کو جاننا چاہئے۔ یہ بھی علم کا ایک درجہ ہے کہ آدمی اپنے نہ جاننے کو جانتا ہو۔



عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن (مکمل)	400.00	عظمت مومن	7.00	دعوت اسلام	50.00
مطالعۂ سیرت	60.00	اسلام: ایک عظیم جدوجہد	5.00	دعوت حق	40.00
اسباق تاریخ	85.00	تاریخ دعوت حق	5.00	نشری تقریریں	80.00
تعمیر حیات	60.00	مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00	دین انسانیت	60.00
تعمیر انسانیت	50.00	ڈائری (جلد اول)	80.00	فکر اسلامی	50.00
سفرنامہ غیر ملکی اسفار، جلد دوم	125.00	کتاب زندگی	65.00	شتم رسول کا مسئلہ	50.00
اسلام: ایک تعارف	80.00	اقوال حکمت	25.00	طلاق اسلام میں	5.00
اللہ اکبر	60.00	تعمیر کی طرف	8.00	مضامین اسلام	60.00
پیغمبر انقلاب	50.00	تبلیغی تحریک	20.00	حیات طیبہ	7.00
مذہب اور جدید چیلنج	65.00	تجدید دین	25.00	باغ جنت	7.00
عظمت قرآن	35.00	عقلیات اسلام	35.00	نار جہنم	7.00
عظمت اسلام	50.00	قرآن کا مطلوب انسان	8.00	سچا راستہ	8.00
عظمت صحابہ	7.00	دین کیا ہے؟	7.00	دینی تعلیم	7.00
دین کامل	60.00	اسلام دین فطرت	7.00	خلیج ڈائری	10.00
الاسلام	45.00	تعمیر ملت	7.00	رہنمائے حیات	7.00
ظہور اسلام	50.00	تاریخ کا سبق	7.00	تعدد ازدواج	7.00
اسلامی زندگی	40.00	فسادات کا مسئلہ	5.00	ہندستانی مسلمان	50.00
احیاء اسلام	35.00	انسان اپنے آپ کو پہچان	5.00	روشن مستقبل	7.00
راز حیات	65.00	تعارف اسلام	5.00	صوم رمضان	7.00
صراط مستقیم	40.00	اسلام پندرہویں صدی میں	5.00	اسلام کا تعارف	5.00
خاتون اسلام	60.00	راہیں بند نہیں	12.00	علما اور دور جدید	10.00
سوشلزم اور اسلام	50.00	ایمانی طاقت	7.00	سفرنامہ اسپین و فلسطین	60.00
اسلام اور عصر حاضر	30.00	اتحاد ملت	7.00	مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	12.00
الربانیۃ	40.00	سبق آموز واقعات	7.00	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	10.00
کاروان ملت	45.00	زلزلہ قیامت	10.00	یکساں سول کوڈ	5.00
حقیقت حج	30.00	حقیقت کی تلاش	10.00	اسلام کیا ہے؟	8.00
اسلامی تعلیمات	35.00	پیغمبر اسلام	5.00	میوات کا سفر	35.00
اسلام دور جدید کا خالق	25.00	آخری سفر	7.00	قیادت نامہ	35.00
حدیث رسول	40.00	اسلامی دعوت	7.00	منزل کی طرف	5.00
سفر نامہ (غیر ملکی اسفار)	85.00	حل یہاں ہے	10.00	اسفار ہند	125.00
راہ عمل	25.00	امہات المومنین	20.00	ڈائری ۱۹۸۹-۹۰	100.00
تعبیر کی غلطی	80.00	تصویر ملت	85.00	قال اللہ و قال الرسول	70.00
دین کی سیاسی تعبیر	20.00				

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان
زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 462 5454, 461 1128
Fax 469 7333, 464 7980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
5801 SW 106th Street, Ft. Lauderdale, FL 33328
U.S.A. Tel/Fax 718-2583439
e-mail: kaleem@alrisala.org

الرسالہ، جنوری، ۲۰۰۱

فہرست



Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051.

اختلاف کی قاتل

دو آدمیوں میں اختلاف ہوا۔ اختلاف بڑھتا رہا، یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ پہلے کے لئے زمین پر سب سے زیادہ قابل نفرت شخص دوسرا تھا اور دوسرے کے لئے زمین پر سب سے زیادہ قابل نفرت شخص پہلا۔

دونوں ایک دوسرے کو ذلیل کرنے اور نقصان پہنچانے میں لگ گئے۔ ہر ایک کے بس میں کہنے اور کرنے کی جو طاقت تھی وہ اس نے پوری طرح دوسرے کی کاٹ میں لگادی۔ دونوں اپنے تخریبی مشغلہ میں مصروف رہے۔ تاہم کوئی دوسرے کو مٹا نہ سکا یہاں تک کہ خود اس کے مٹنے کا وقت آگیا۔ آخرکار دونوں کے درمیان جس چیز نے فیصلہ کیا وہ موت تھی۔ موت نے ہر ایک کو اسی قبر میں پہنچا دیا جس میں وہ اپنے بھائی کو پہنچانے کا عزم کئے ہوئے تھا۔

موت کا یہ واقعہ ہر روز ہمارے سامنے پیش آتا ہے، ہر دن کوئی شخص جو دوسرے کو قبر کے گڑھے میں پہنچانا چاہتا تھا، خود قبر کے گڑھے میں پہنچ جاتا ہے۔ مگر کوئی اس سے سبق نہیں لیتا۔ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ موت کا واقعہ اسی آدمی کے لئے ہے جس کے ساتھ وہ بظاہر پیش آیا ہے، خود اس کے اپنے لئے یہ واقعہ کبھی پیش نہیں آئے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ موت کی یاد ہر قسم کے اختلاف اور دشمنی کی قاتل ہے۔ موت آدمی کی ذات کو ختم کرتی ہے اور موت کی یاد آدمی کی برائیوں کو۔ مگر کوئی آدمی موت کو یاد نہیں کرتا۔ موت کا واقعہ کسی آدمی کے لئے اس کی برائیوں کو ختم کرنے کا سبب نہیں بنتا۔

حدیث میں ہے کہ موت کو خوب یاد کرو جو لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے (اکثروا ذکر ھادم اللذات) کسی آدمی کے لئے سب سے بڑی لذت یہ ہے کہ وہ اپنے مخالف کو برباد ہوتا ہوا دیکھے۔ لیکن اگر آدمی موت کو یاد کرنے لگے تو اپنی بربادی کا اندیشہ اس سے دوسرے تمام احساسات کو اس طرح چھین لے گا کہ اس کو یاد بھی نہ رہے گا کہ اس کا کوئی مخالف ہے جس کی بربادی کا منصوبہ اسے بنانا چاہئے۔

ایسا انسان جو ہر لمحہ موت کی زد میں ہو وہ کسی دوسرے کو کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ آدمی خود اپنی موت کے کنارے کھڑا ہوا ہے مگر وہ سمجھتا ہے کہ وہ دوسرے شخص کو اس کی موت کے کنارے پہنچا رہا ہے۔ نادانی کی یہ قسم بھی کیسی عجیب ہے۔

باہمی اختلاف

واطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصابرین (انفال ۴۶)

اے مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو۔ اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تمھارے اندر کمزوری آجائے گی اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر کرو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مسلمان اگر مل جل کر رہیں۔ وہ اللہ اور رسول کی مرکزیت کے گرد متحد رہیں تو وہ زبردست طاقت ہوتے ہیں۔ دیگر قوموں کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ان کے اکثر کام محض رعب و دبدبہ سے انجام پاتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ان میں آپس کا اختلاف پیدا ہو جائے تو دوسروں کی نظر میں ان کی ہوا اکھڑ جاتی ہے۔ ان کے دشمن ان پر ہاتھ ڈالنے کے لئے جری ہو جاتے ہیں۔

اتحاد و اتفاق کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ صبر ہے۔ کیوں کہ جب بھی بہت سے لوگ ایک ساتھ رہیں گے تو ان کے درمیان طرح طرح کی شکایتیں پیدا ہوں گی۔ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچے گی۔ کبھی کسی کی تنقید پر کسی کو غصہ آئے گا، کبھی کسی کی ترقی سے کسی کے دل میں جلن پیدا ہوگی۔ کبھی لین دین میں ایک دوسرے کا مفاد ٹکرائے گا۔ کبھی ایک شخص کی امیدیں دوسرے سے پوری نہ ہوں گی اور اس کے جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ اس طرح کے بہت سے اسباب ہیں جو لازماً پیدا ہوں گے۔ ان اسباب کی پیدائش کو روکنا ممکن نہیں ہے۔ ممکن صرف یہ ہے کہ آدمی ناخوش گواریوں کو سہے اور جب بھی اس قسم کی کوئی صورت پیش آئے تو اللہ کے لئے اس پر صبر کرلے۔ اختلاف کو برداشت کرنے کی زمین پر اتحاد وجود میں آتا ہے نہ کہ اختلاف کو ختم کرنے کی زمین پر۔ جو لوگ اختلاف اور شکایت کو برداشت کرکے متحد رہ سکیں وہی اپنے درمیان اتحاد قائم کرتے ہیں۔ زندگی کی بیشتر کامیابیوں کا راز صبر ہے اور اسی طرح اتحاد کا بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اتحاد نام ہے اختلاف کے باوجود متحد رہنے کا۔ اگر یہ برداشت اور یہ وسعت ظرف نہ ہو تو اتحاد کبھی وجود میں نہیں آسکتا۔

آج ہر طرف مسجدیں بھری ہیں۔ ہر جگہ بے شمار لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود مسلمان کیوں ذلیل ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں پر اللہ کی نصرت کیوں نازل نہیں ہوتی۔ اتنے بے شمار لوگ اللہ سے تعلق جوڑے ہوئے ہیں، پھر بھی اللہ ان کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے مسلمانوں کا باہمی اختلاف۔ خدا سے جڑنے کے لئے ہر آدمی مسجد کی طرف بھاگ رہا ہے مگر انسان سے جڑنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ انفرادی عبادت ہر ایک کر رہا ہے۔ مگر اجتماعی عبادت جس کا دوسرا نام اتحاد ہے، اس میں اپنے کو شامل کرنے کی اہمیت کو کوئی نہیں جانتا۔

باعزت زندگی ایک ایک مسلمان کو الگ الگ نہیں مل سکتی۔ وہ جب بھی ملے گی پورے گروہ کو یکجائی طور پر

تاریخ کا مطالعہ

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کی تاریخ گھڑی کے پنڈولم کی طرح بار بار ایک انتہاء سے دوسرے انتہاء کی طرف گردش کرتی رہی ہے ـــــ شخصی حکمرانی سے عوامی جمہوریت کی طرف، غلامی سے آزادی کی طرف، انفرادی نظام سے سوشلسٹ نظام کی طرف، کنٹرول اکانومی سے لبرل اکانومی کی طرف، وغیرہ۔

اس تاریخی صورت حال کو کارل مارکس نے جدلی مادیت (dialectical materialism) کا نام دیا ہے۔ اس کے نزدیک یہ تاریخ انسانی کا ارتقائی سفر ہے جو فطرت کے اپنے لازمی قوانین کے تحت ہو رہا ہے۔ اس کے نزدیک فطرت کا یہ عمل انسانی سماج میں طبقاتی کش مکش کے ذریعہ ہوتا ہے۔ سماج کے اندر پہلے داخلی قوانین کے تحت ایک مقدمہ (thesis) سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد خود انسانی سماج کے داخلی قوانین کے تحت جوابی مقدمہ (anti-thesis) ظہور میں آتا ہے۔ پھر ان دونوں کے درمیان باہمی ٹکراؤ پیش آتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایک نیا امتزاج (synthesis) بنتا ہے۔ یہ عمل بار بار جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ انسانی تاریخ اپنے آخری ارتقائی درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔

کارل مارکس (۱۸۱۸۔ ۱۸۸۳) کی یہ بات محض ایک خیالی مفروضہ تھی۔ یہ خیالی مفروضہ علمی اعتبار سے اول دن ہی سے غیر ثابت شدہ تھا۔ مگر 1991 میں روس کے کمیونسٹ سسٹم کا ٹوٹنا، اور اسی طرح ہندستان سمیت دوسرے اس قسم کے ملکوں میں سوشلسٹ معاشیات کا مکمل طور پر ناکام ہو جانا، مارکس کے نظریہ کی آخری تردید ہے۔

مارکس اور اس کے ساتھیوں نے اپنے تجزیہ کے مطابق یہ دعویٰ کیا تھا کہ انسانی تاریخ ہزاروں سال کے جدلیاتی سفر کے بعد اپنی آخری ارتقائی منزل تک پہنچ چکی ہے۔ یہ آخری ارتقائی منزل اس کے نزدیک سوشلسٹ سماج تھا۔ مگر بیسویں صدی کے آخر میں سوشلسٹ

اکانومی کی تباہ کن ناکامی نے آخری طور پر ثابت کر دیا ہے کہ مارکس اور اس کے ساتھیوں نے انسانی زندگی کا جو نظریہ پیش کیا تھا وہ صرف ایک تخیلاتی مفروضہ تھا، وہ کسی بھی درجہ میں حقائق وواقعات پر مبنی نہ تھا۔

کارل مارکس اوراس طرح کے دوسرے مفکرین کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے انسانی تاریخ کو زندہ اور غیر زندہ مادی کائنات پر قیاس کیا۔انہوں نے یہ سمجھا کہ جس طرح مادی کائنات ناقابل تغیر فطری قوانین (natural laws) کے تحت چل رہی ہے، اسی طرح انسانی تاریخ بھی اٹل قسم کے غیر متغیر قوانین کے تحت اپنا سفر کر رہی ہے۔حالانکہ یہ قیاس مع الفارق تھا۔بے جان مادہ بلاشبہہ غیر متغیر قوانین کا پابند ہے۔مگر انسان ایک آزاد اور بااختیار مخلوق ہے، وہ خود اپنے ارادہ کے تحت عمل کرتا ہے، نہ کہ لازمی قسم کے کسی خارجی قانون کے تحت۔

انسان کی یہی بے قید آزادی وہ چیز ہے جو تمام تاریخی مسائل کی اصل ذمہ دار ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ کے تمام مسائل انسانی آزادی کے غلط استعمال (misuse) کا نتیجہ ہیں۔

انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے ایک دہرا مشکل (dilemma) کا شکار ہے۔ایک طرف وہ اپنے قول اور عمل کے لئے مکمل طور پر آزاد ہے، اسے کامل اختیار حاصل ہے کہ وہ جو چاہے بولے اور جو چاہے کرے۔ مگر معاملہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ سب کچھ اسے ایک ایسی دنیا میں کرنا ہے جس کو اس نے نہ خود بنایا اور نہ وہ اس کے احکام کی تابع ہے۔ یہ خارجی دنیا انسانی ارادے سے آزاد خود اپنے محکم قوانین کے تحت عمل کرتی ہے۔

اس صورت حال کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے ارادہ کے اظہار کے اعتبار سے تو کامل طور پر آزاد ہے، مگر اپنے ارادے کی کامل تعمیل کے اعتبار سے وہ آزاد نہیں۔اپنے ذہن کے دائرہ میں سوچتے ہوئے بظاہر وہ اپنے آپ کو پوری طرح آزاد پاتا ہے، مگر جیسے ہی وہ اپنی ذہنی سوچ کو خارج میں واقعہ بنانا چاہتا ہے، اس کو فوراً ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہاں مختلف قسم کی

محدودیتیں (limitations) اس کے راستہ میں حائل ہیں۔ اس طرح انسان اس دنیا میں ایک ایسی مخلوق بن جاتا ہے جو سوچنے کے اعتبار سے لامحدود طور پر آزاد ہے مگر اپنی سوچ کو عملی واقعہ بنانے کے اعتبار سے وہ انتہائی زیادہ محدود ہے۔

یہ حقیقت بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا میں آدمی صرف اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب کہ وہ اپنی زندگی کی منصوبہ بندی اس طرح کرے کہ اس میں اس کی محدودیتوں کی رعایت شامل ہو۔ جس منصوبہ بندی میں انسانی محدودیت کی کامل رعایت نہ کی گئی ہو اس کا اس عالم اسباب میں ناکام ہونا اتنا زیادہ یقینی ہے کہ اس سے زیادہ یقینی اور کوئی بات نہیں۔

اس حقیقت کی روشنی میں دیکھا جائے تو مذکورہ تاریخی ظاہرہ (historical phenomenon) کی تشریح کرنا بخوبی طور پر ممکن ہو جاتا ہے۔ وہ تشریح یہ ہے کہ انسان یہ کرتا ہے کہ وہ اپنی خواہش اور ارادے کے تحت ایک سمت میں اقدام کرتا ہے۔ اپنی ذاتی خواہش کے اعتبار سے وہ اس اقدام میں آخری انتہاء تک پہنچ جانا چاہتا ہے۔ مگر ابھی اس کا سفر پورا نہیں ہوتا کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایسی محدودیتوں کا شکار ہو گیا ہے جو فیصلہ کن طور پر اس کے راستوں میں حائل ہیں۔ اس صورت حال کے نتیجہ میں اس کے اندر رد عمل (reaction) کی نفسیات پیدا ہوتی ہے۔ اس رد عمل کے زیر اثر وہ لوٹتا ہے اور دوسری انتہا کی طرف بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ مگر دوبارہ یہی ہوتا ہے کہ اس کا سفر مکمل نہیں ہوتا کہ درمیان ہی میں وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا سفر فیصلہ کن محدودیتوں کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے بعد پھر وہ یہی کرتا ہے کہ دوسری انتہا کی طرف دوڑنا شروع کر دیتا ہے، صرف اس لئے کہ وہ دوبارہ پہلے ہی کی طرح ناقابل عبور محدودیتوں کا شکار ہو اور پھر وہاں سے لوٹ کر الٹی سمت میں دوبارہ ایک ایسے سفر کا آغاز کر دے جس کی ناکامی پیشگی طور پر معلوم اور مقدر ہو۔

انسان کی یہی دوطرفہ حیثیت ہے جس کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ انسان کی تاریخ گھڑی کے پنڈولم کی مانند بار بار ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف جارہی ہے۔ ہزاروں سال تک سفر

کرنے کے باوجود وہ اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچتی۔ تقریباً پوری انسانی تاریخ اسی قسم کی ناکامی کی ایک مسلسل کہانی ہے۔

انسان کے سوا جو مادی کائنات ہے، اس میں ناکام تجربات کا یہ المیہ مطلق نظر نہیں آتا۔ غیر ذی روح مادی اشیاء کا سفر کامل صحت کے ساتھ اربوں سال سے مسلسل جاری ہے۔ قرآن (الملک ۳) کے الفاظ میں اس کے اندر کسی فتور (flaw) کا کوئی وجود نہیں۔ وہ کامل بے نقص انداز میں مسلسل اور دائمی طور پر چلی جارہی ہے۔

مادی اشیاء کا اس طرح بے نقص ہونا اس لئے ہے کہ اس خطہ کائنات میں انسانی دنیا کی طرح آزادانہ اختیار (free will) کا وجود نہیں۔ یہ حصہ کائنات مکمل طور پر جبر (determinism) کے تحت ہے۔ مادی دنیا اپنے ذاتی ارادہ کے تحت کوئی خود ساختہ کورس اختیار نہیں کرتی جس میں اسے انسان جیسی محدودیت سے دوچار ہونا پڑے۔ مادی دنیا عین وہی عمل کرتی ہے جو قانونِ فطرت کے تحت اسے کرنا چاہئے، اور اس عمل سے ہمیشہ باز رہتی ہے جو اسے نہیں کرنا چاہئے۔ یہی وہ فرق ہے جس نے مادی دنیا کو، انسانی دنیا کے برعکس، ایک ایسی دنیا بنادیا ہے جہاں ناکامیوں اور پسپائیوں کی دو طرفہ داستان موجود نہیں۔

اس مسئلہ کا حل کیا ہے۔ انسانی زندگی میں ارادہ اور عمل کے درمیان جو تضاد پایا جاتا ہے اس تضاد کا حل کیا ہے، اسی مسئلہ کے حل کے لئے خالق کائنات نے اپنے پیغمبر مبعوث کئے۔ ان پیغمبروں کو اللہ نے حقیقت کا کلی علم دیا۔ اور انہیں یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ انسان کو اس کے حدود (limitations) سے آگاہ کردیں۔ وہ اس کو بتائیں کہ انسان اگرچہ ذاتی ارادہ کے اعتبار سے لامحدود ہے، مگر وہ اپنے ارادہ کی خارجی تعمیل کے اعتبار سے یقینی طور پر محدود ہے۔

پیغمبرانہ مشن کا یہی وہ پہلو ہے جس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: وحدّ حدوداً فلا تعتدوھا (الدار قطنی، بحوالہ مشکاۃ المصابیح ۱/۶۹) یعنی اللہ نے تمہارے لئے حدیں (limitations) مقرر کردی ہیں، تو تم ان حدوں سے تجاوز نہ کرو۔

یہ گویا پیغمبر کی زبان سے ایک خدائی انتباہ (warning) ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اس کے خالق نے یہ خصوصی امتیاز دیا ہے کہ اس کو کامل آزادی عطا فرمائی ہے۔ تاہم اسی کے ساتھ انسان کو یہ جاننا چاہئے کہ اگر وہ اپنی آزادی کا لامحدود استعمال کرے گا تو وہ اس دنیا میں انارکی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ اس بنا پر انسان کے لئے درست طریقہ یہ ہے کہ وہ خدا کے پیغمبر کی ہدایت (guidance) سے فائدہ اٹھائے۔ وہ اپنی آزادی کو جاننے کے ساتھ اپنی واقعی حدود کو بھی جانے، جو پیغمبر کے ذریعہ اس کو بتائی جارہی ہے۔ حدود کی معرفت کے بغیر انسانی آزادی انارکی بن کر رہ جاتی ہے، اور حدود کی معرفت کے ساتھ انسانی آزادی اسی طرح اپنی ایک کامل دنیا کی تخلیق کر سکتی ہے جس طرح مادی دنیا ایک کامل نمونہ کی صورت میں نظر آرہی ہے۔

اس دنیا میں ہمیں انسانی تشکیل کے دو واضح نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک وہ جس کو روسی ماڈل کہا جاسکتا ہے۔ دوسرا وہ جس کو امریکی ماڈل کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، روسی ماڈل ۷۵ سالہ تجربہ کے باوجود مکمل طور پر ناکام ہو گیا۔ وہ قابل بقاء (sustainable) ثابت نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس امریکی ماڈل سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت سے چلا جارہا ہے۔ بظاہر وہ پوری طرح قابل بقاء (sustainable) ہے۔

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ روسی ماڈل تو ضرور قابل رد ہے، مگر امریکی ماڈل قابل رد نہیں، حالانکہ امریکی ماڈل کو پیغمبرانہ ھدایت کی بنیاد پر قائم نہیں کیا گیا، اور نہ وہ پیغمبرانہ ہدایت کی بنیاد پر چلایا جارہا ہے۔

اس معاملہ کی حقیقت یہ ہے کہ امریکی ماڈل اگرچہ براہ راست طور پر پیغمبرانہ ہدایت کی بنیاد پر قائم نہیں گیا مگر بالواسطہ طور پر وہ پیغمبرانہ ہدایت ہی کی جزئی تعمیل ہے۔ پیغمبرانہ ہدایت کا ایک پہلو وہ ہے جو آخرت کی کامیابی سے متعلق ہے۔ اس پہلو سے امریکی ماڈل مکمل طور پر پیغمبرانہ ہدایت سے دور ہے۔ مگر پیغمبرانہ ہدایت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ انسان اپنی دنیا کی تعمیر حقائقِ فطرت کی روشنی میں کرے۔ یہی وہ پہلو ہے جس کی بابت پیغمبر اسلام نے فرمایا: انتم اعلم بأمر دنیاکم (صحیح مسلم)۔

امریکی ماڈل کی ظاہری کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ قانونِ فطرت کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا ہے۔ جب کہ روسی ماڈل کی ناکامی کا راز یہ ہے کہ اس کی تشکیل میں فطرت کے قانون کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ امریکی ماڈل اگر پیغمبرانہ ہدایت سے پچاس فیصد محروم تھا تو روسی ماڈل پیغمبرانہ ہدایت سے صد فی صد محروم۔

اس اعتبار سے، امریکی ماڈل اور روسی ماڈل کے فرق کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ امریکی ماڈل فطرت کے اعتراف مگر نبوت کے انکار پر مبنی ہے۔ جب کہ روسی ماڈل بیک وقت فطرت کا بھی انکار کرتا ہے اور نبوت کا بھی انکار۔ گویا امریکی ماڈل اگر پچاس فی صد صداقت سے خالی ہے تو روسی ماڈل صد فی صد صداقت سے خالی۔

چند سال پہلے امریکہ میں ایک کتاب چھپی تھی۔ اس کتاب کے مصنف نے امریکی معاشرے کا جائزہ لینے کے بعد کہا تھا کہ امریکی معاشرہ بے قید آزادی کے اصول پر قائم ہے، مگر حقائق بتاتے ہیں کہ ہم آزادی کا تحمل نہیں کر سکتے: We can't afford freedon

یہ کتاب گویا اس بنیادی کمزوری کی نشاندہی کرتی ہے جو ظاہری کامیابی کے باوجود امریکی ماڈل کو لاحق ہے۔ امریکی ماڈل کی ظاہری کامیابی کا راز یہ ہے کہ اس نے انسانی فطرت کو سمجھتے ہوئے ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جو تمام تر مبنی بر مفاد (interest-based) معاشرہ تھا۔ انسان کے اندر سب سے زیادہ طاقت ور جذبہ ذاتی مفاد کا جذبہ ہے۔ امریکی ماڈل میں اسی ذاتی جذبے کو بھر پور طور پر استعمال کیا گیا۔ یہی واحد راز ہے جس کی بنا پر امریکہ ایک قابل بقا (sustainable) معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے برعکس روسی ماڈل اس لئے ناکام ہوا کہ اس میں اس انسانی فطرت کا انکار کر دیا گیا تھا۔

تاہم امریکی ماڈل، اپنی ظاہری خوشنمائی کے باوجود ایک لازمی کمزوری سے دوچار ہے۔ اسی کمزوری کا نتیجہ ہے کہ امریکی معاشرہ ظاہری ترقی کے باوجود مختلف قسم کے ناقابل حل مسائل سے دوچار ہے اور امریکی مدبرین کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ان مسائل کو کس طرح حل

کریں۔ مثلاً تشدد، ازدواجی تعلقات کا عدم استحکام، شراب اور جنسی انارکی سے پیدا ہونے والی بیماریاں، وغیرہ۔ حتی کہ سیاسی چپقلش جس کا ایک مظاہرہ نومبر ۲۰۰۰ کے صدارتی انتخابات میں دوٹوں کی گنتی کے معاملہ میں ہوا۔

اس قسم کے مسائل کا بنیادی سبب یہ ہے کہ امریکی انسان کے پاس ایسا کوئی قابل یقین علم نہیں جس کے ذریعہ وہ اپنی حدود (limitations) کو جان سکے اور اپنی بے قیدی کو پابندی کے دائرے میں لے آئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں امریکی انسان کو پیغمبرانہ ہدایت کی ضرورت ہے۔ آج امریکی انسان کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اس کو یہ بتایا جائے کہ انسانی آزادی کے حدود کیا ہیں۔ پیغمبرانہ ہدایت ہی اس معاملہ میں انسان کے لئے رہنمائی کا واحد یقینی ذریعہ ہے۔

پیغمبرانہ ہدایت بتاتی ہے کہ انسان اگر اپنی آزادی کو حدود کا پابند نہ بنائے تو اس کی آزادی مہلک انارکی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ انسان پُرامن عمل کے لئے آزاد ہے مگر وہ متشددانہ عمل کے لئے آزاد نہیں۔ انسان جائز تجارت کے لئے آزاد ہے مگر وہ مالی استحصال کے لئے آزاد نہیں۔ انسان ازدواجی تعلقات کے لئے آزاد ہے مگر وہ آزادانہ جنسی تعلق کے لئے آزاد نہیں، انسان صحت بخش چیزوں کے استعمال کے لئے آزاد ہے مگر وہ نشہ آور چیزوں کے استعمال کے لئے آزاد نہیں، وغیرہ۔

حد بندی فطرت کا قانون ہے، مگر انسان خود اپنی عقل یا اپنی سائنس کے ذریعہ اس کا درست علم حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پیغمبر خدا کی ہدایت کے تحت انسان کی مدد کرتا ہے۔ پیغمبر خدائی وحی کی روشنی میں انسان کو یہ بتاتا ہے کہ وہ کن حدود کا پابند رہ کر اس دنیا میں زندگی گزارے۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر کی ہدایت ہی انسان کو اس ناکامی سے بچاتی ہے کہ وہ گھڑی کے پنڈولم کی طرح دو انتہاؤں کے درمیان گردش کرتا رہے۔ پیغمبر کے ذریعہ انسان اس صراط مستقیم کو پالیتا ہے جو مطلوب انسانی منزل کی طرف سیدھی چلی جارہی ہے، جو آدمی کو انتہا پسندانہ

ٹھوکروں سے بچا کر اس قابل بناتی ہے کہ وہ سچائی کی شاہراہ پر سیدھا چلتا رہے یہاں تک کہ اپنی منزل تک پہنچ جائے۔

پیغمبرانہ ہدایت انسان کو بیک وقت دو چیزیں دیتی ہے ــــــ صحیح حدودکار کا علم اور ان حدود کو عملاً اپنی زندگی میں اختیار کرنے کا محرک (incentive)۔ یہ دونوں چیزیں بیک وقت ضروری ہیں، ایک کے بغیر اس دنیا میں دوسری چیز نامکمل رہتی ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، پیغمبر انسان کو بتاتا ہے کہ آدمی اپنی زندگی کی مختلف سرگرمیوں میں کہاں تک جائے اور کہاں تک پہنچ کر رک جائے۔ اسی کے ساتھ دوسری اہم چیز جو پیغمبر کے ذریعہ انسان کو بتائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ حدودکار کا یہ معاملہ خدائی قانون کا معاملہ ہے نہ کہ سادہ طور پر انسانی قانون کا معاملہ۔ انسان اگر اس حدودکار کی پابندی کرے تو وہ دنیا میں ایک کامیاب زندگی کی تعمیر کرے گا اور اسی کے ساتھ موت کے بعد کی زندگی میں وہ ابدی جنت میں داخلہ کا مستحق قرار پائے گا۔

لیکن انسان اگر اس حدودکار کی پابندی نہ کرے تو صرف یہی نہیں ہوگا کہ اس کی دنیوی زندگی کے معاملات بگڑ جائیں گے، وہ زمین پر ایک صالح معاشرہ قائم کرنے میں ناکام رہے گا۔ اسی کے ساتھ وہ اپنے آپ کو اس سنگین انجام کا مستحق بناتا ہے کہ اس کا خالق اس پر غضبناک ہو اور موت کے بعد اس کو ابدی جہنم میں ڈال دے۔

پیغمبرانہ ہدایت میں یہ دوطرفہ محرک اس بات کی یقینی ضمانت ہے کہ انسان اس ہدایت کو لازماً اختیار کرے، خود اپنے ذاتی مفاد کا محرک اس کو مجبور کردے کہ وہ اس روش سے انحراف نہ کرے۔ وہ دل کی آمادگی کے ساتھ اس پر قائم ہو جائے۔

فراست مومن

پیغمبر اسلام ﷺ کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ آپ صاحب حکمت تھے اور لوگوں کو حکیمانہ روش اختیار کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ اس سلسلہ میں آپ کے بہت سے اقوال حدیث کی کتابوں میں آئے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ نے فرمایا: لاحسد الا فی اثنتین رجل آتاہ اللہ مالا فسلطه علی هلکته فی الحق ،واخر اتاه الله حکمة فهو یقضی بها ویعلمها (فتح الباری ،بشرح صحیح البخاری ۱۲۸/۱۳)

یعنی حسد نہیں سوا دو قسم کے آدمیوں پر۔ ایک وہ آدمی جس کو اللہ نے مال دیا تو وہ اس کو حق کے راستہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔ اور دوسرا آدمی وہ جس کو اللہ نے حکمت دی تو وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور کہا کہ اے اللہ اس کو حکمت عطا فرما (ضمنی النبی ﷺ الی صدرہ وقال اللهم علمه الحکمة) فتح الباری ۱۲۶/۷

اسی طرح اور بہت سی روایتیں ہیں جن سے حکمت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نعم المجلس مجلس ینشر فیه الحکمة (الدارمی مقدمه) یعنی کیا ہی اچھی ہے وہ مجلس جس میں حکمت کی بات کی جائے۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ لیس هدیة افضل من کلمة حکمة (الدارمی ، مقدمه) یعنی حکمت کی بات سے زیادہ افضل کوئی تحفہ نہیں۔

حکمت کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کی بابت یہ تعلیم دی گئی کہ دوسری قوموں میں

اگر کوئی حکمت کی چیز ملے تو اس کو لینے سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: الكلمة الحكمة ضالة المومن حيث وجدها فهواحق بها (الترمذی، کتاب العلم) یعنی حکمت کی بات مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے وہ جہاں اس کو پائے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔

بعض روایت کے مطابق، حکمت اور تفقہ کی اہمیت عبادت سے بھی زیادہ ہے۔ چنانچہ الترمذی اور ابن ماجہ میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد (مشکاۃ المصابیح ۱/۷۵) یعنی ایک فقیہ، شیطان کے اوپر ہزار عابدوں سے بھی زیادہ بھاری ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی پوری زندگی حکمت کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ نبوت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے آپ نے ہر موقع پر اور ہر مرحلہ میں حکمت کا طریقہ اختیار فرمایا۔ یہاں اس سلسلہ میں آپ کی زندگی سے چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

نزاع کے موقع پر

پیغمبر اسلام ﷺ کی عمر جب ۳۵ سال تھی اس وقت مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ کعبہ کی عمارت بعض اسباب سے منہدم ہو گئی۔ اس کے بعد قریش کے لوگوں نے اس کی نئی تعمیر کی۔ اس دوران یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ حجر اسود کو کون اٹھائے اور اس کو دوبارہ اس کی جگہ پر کعبہ کی دیوار میں نصب کرے۔ یہ چونکہ فضیلت کا ایک معاملہ تھا، ہر ایک یہ چاہنے لگا کہ وہی اس کو اٹھا کر نصب کرے اور اس شرف کا مالک بنے۔

اس سوال پر قریش کے لوگوں میں کئی دن تک جھگڑا جاری رہا اور کوئی اتفاقی فارمولا طے نہ ہو سکا آخر کار قریش کے ایک بزرگ کی تجویز کے مطابق وہ اس پر راضی ہوئے کہ

کل صبح کو جو آدمی سب سے پہلے کعبہ میں داخل ہو، وہی اس مسئلہ کا فیصلہ کرے اور تمام لوگ اس کے فیصلہ کو مان لیں۔ اگلی صبح کو جب لوگ دوبارہ کعبہ میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ کعبہ میں داخل ہونے والے سب سے پہلے شخص رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ہر ایک نے بیک زبان کہا: هذا الامين رضينا هذا محمد (سیرت ابن ہشام ۱/ ۲۱۴) یعنی یہ تو محمد الامین ہیں، ہم ان کے فیصلہ پر راضی ہیں۔

رسول اللہ نے لوگوں سے کہا کہ ایک چادر لے آؤ۔ وہ لوگ چادر لائے تو آپ نے اس کو زمین پر پھیلایا اور حجر اسود کو اٹھا کر اس کے اوپر رکھ دیا۔ پھر آپ نے لوگوں سے کہا کہ تم سب لوگ چادر کے کناروں کو پکڑو اور اس کو اٹھا کر کعبہ کی دیوار کے پاس لے چلو۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر آپ نے حجر اسود کو چادر سے اٹھایا اور اس کو کعبہ کی دیوار میں نصب کر دیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ عمل ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نزاعی معاملہ کو کس طرح خوش اسلوبی کے ساتھ طے کیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ حکیمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے ہر ایک کو اس میں شریک کر لیا جائے۔ اس طرح کا معاملہ لوگوں کے لئے اکثر وقار کا سوال بن جاتا ہے۔ اگر حسن تدبیر سے لوگوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ ان کا وقار محفوظ ہے تو مسئلہ کو حل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

آغاز کار

پیغمبر اسلام ﷺ کو جب مکہ میں نبوت ملی تو آپ نے اپنے عمل کا یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ آپ لوگوں کے پاس جاتے اور ان سے کہتے کہ اے لوگو، کہو کہ ایک اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں، تم فلاح پاؤ گے (ايها الناس قولوا لا اله الا الله تفلحوا) یعنی تم لوگ شرک کو

چھوڑ دو اور ایک خدا کی پرستش کا طریقہ اختیار کرو، تم فلاح پاؤ گے۔

اس وقت کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ اب ایک صورت یہ تھی کہ کعبہ کو بتوں سے پاک کر کے اس کو توحید کے مرکز کے طور پر بنایا جاتا۔ مگر اس وقت وہ عملاً شرک وبت پرستی کا مرکز بن گیا تھا۔ ان حالات میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے دو مختلف راستے تھے۔ ایک یہ کہ کعبہ سے بتوں کو نکال کر وہاں دوبارہ توحید کا ماحول قائم کریں اور اس کو مرکز بنا کر اپنی موحدانہ تحریک چلائیں۔

ایک صورت قولی دعوت سے آغاز کرنے کی تھی۔ اور دوسری صورت عملی اقدام سے آغاز کرنے کی۔ جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے، آپ نے عملی اقدام سے مکمل طور پر پرہیز کیا، اور صرف قولی دعوت کے نہج پر مکہ میں اپنا پیغمبرانہ مشن جاری فرمایا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت یا اسلامی تحریک کا صحیح پیغمبرانہ طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلے پر امن فکری مہم کے ذریعہ لوگوں کی سوچ اور کردار میں تبدیلی لائی جائے۔ یہ ابتدائی کام جب قابل لحاظ حد تک انجام پا جائے، اس کے بعد حسب حالات عملی اقدام کا آغاز کیا جائے۔

توہین کو برداشت کرنا

مشہور سیرت نگار ابن اسحٰق بتاتے ہیں کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کا نام مذمم رکھا تھا۔ پھر وہ آپ کا سب وشتم کرتے تھے۔ اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھیوں سے فرماتے تھے کہ کیا تم کو اس پر تعجب نہیں کہ اللہ نے کس طرح مجھ کو قریش کی ایذا رسانی سے بچا لیا۔ وہ سب وشتم کرتے ہیں اور ایک مذمم شخص کی ہجو کرتے ہیں اور میں محمد ہوں۔

وكانت قريش انما تسمى رسول الله ﷺ مذمما ثم يسبونه فكان رسول الله ﷺ يقول: "الا تعجبون لما صرف الله عنى من اذى قريش يسبون ويهجون مذمما وانا محمد" (سيرت ابن هشان ۱/ ۳۷۹)

پیغمبر اسلام ﷺ کا اصل نام محمد تھا جس کا مطلب ہے تعریف کیا ہوا۔ مکی دور میں جب قریش کو آپ کے ساتھ عناد پیدا ہوا تو انھیں پسند نہیں آیا کہ وہ آپؐ کو محمد (تعریف کیا ہوا) جیسے نام سے پکاریں۔ انھوں نے اپنے جذبہ عناد کی تسکین کے لئے بطور خود آپ کا نام مذمم رکھ دیا جس کے معنی ہیں مذمت کیا ہوا۔ قریش جب آپ کو برا بھلا کہتے تو وہ آپ کے لئے محمد کا لفظ استعمال نہ کرتے بلکہ وہ مذمم کا لفظ بول کر آپ کو برا بتاتے۔ حتی کہ ابولہب کی بیوی ام جمیل نے خود آپ کے سامنے آکر کہا: مذمما عصینا (صفحہ ۳۷۹) یعنی یہ مذمم ہیں اور ہم ان کو نہیں مانتے۔

یہ بلاشبہ ایک اشتعال انگیزی تھی اور آپ کی توہین بھی۔ لیکن پیغمبر اسلام نے ایک خوبصورت جواب دے کر اس کو نظر انداز کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ مذمم کی سب وشتم کرتے ہیں۔ مگر ان کی سب وشتم میرے اوپر پڑنے والی نہیں کیوں کہ میرا نام محمد ہے نہ کہ مذمم۔

پیغمبر اسلام ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو یہاں عبداللہ بن ابی آپ کا شدید مخالف بن گیا۔ اس نے اگرچہ اسلام قبول کر لیا تھا مگر حسد کے جذبہ کے تحت وہ آپ کا شدید مخالف بن گیا۔ آپ کی توہین کرنا، آپ کا سب وشتم کرنا اور آپ کے خلاف بری باتیں پھیلانا اس کا سب سے بڑا مشغلہ بن گیا۔ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ وہ سب سے بڑا شاتم رسول تھا۔ حضرت عمر فاروق نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کو قتل

کردوں۔ آپ نے فرمایا: دعه لا یتحدث الناس ان محمدا یقتل اصحابه. (فتح الباری ۸/ ۵۲۰) یعنی اس کو چھوڑدو۔ لوگ یہ نہ کہیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

اس واقعہ سے پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک خاص اسوہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ...... توہین کو برداشت کرلو۔ کیونکہ اگر تم نے توہین کو برداشت نہ کیا تو اس سے بھی زیادہ بڑی برائی سامنے آئے گی، اور وہ خدا کے دین کی بدنامی ہے۔

قبل از وقت اقدام نہیں

پیغمبر اسلام ﷺ تقریباً ۱۳ سال تک مکہ میں رہے یہاں کی اکثریت آپ کی مخالف بنی رہی۔ انھوں نے ہر طرح آپ کو ستایا۔ تاہم آپ کے دعوتی جدوجہد کے نتیجہ میں وہاں کے تقریباً دو سو مرد اور عورت اسلام میں داخل ہوگئے۔ یہ لوگ بار بار آپ سے یہ کہتے کہ ہم ظلم کے خلاف جہاد کریں گے۔ مگر آپ ہمیشہ انھیں صبر کی تلقین کرتے رہے۔ مثلاً حضرت عمر فاروق نے قریش کے مظالم کے خلاف جہاد کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا: یا عمر انا قلیل (سیرت ابن کثیر ۱/ ٤٤١) یعنی اے عمر ہم تھوڑے ہیں۔

مکی دور کے آخر میں مدینہ کے تقریباً دو سو آدمی اسلام میں داخل ہوگئے۔ ان لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ مکہ کے لوگ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو ظلم وزیادتی کا نشانہ بنارہے ہیں تو انھوں نے بھی کہا کہ ہم کو ان ظالموں کے خلاف لڑنے کی اجازت دیجئے مگر ان سے بھی آپ نے یہی فرمایا کہ صبر کرو کیوں کہ مجھے قتال کی اجازت نہیں دی گئی۔ (اصبروا فانی لم اومر بالقتال)

پیغمبر اسلام ﷺ نے ہر قسم کے ظلم وزیادتی کے باوجود تقریباً ۱۵ سال تک یکطرفہ

طور پر صبر وبرداشت کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کے بعد پہلی بار آپ غزوۂ بدر کے موقعہ پر اپنے اصحاب کو لیکر دشمنوں سے مقابلے کے لئے نکلے۔ یہ بھی آپ نے اس وقت کیا جب کہ اللہ تعالی کی طرف سے یہ کھلا وعدہ آگیا کہ آسمان سے فرشتے تمہاری مدد کے لئے آئیں گے۔ (الانفال۹)

پیغمبر اسلام ﷺ کا طریقہ یہ نہیں کہ جب بھی کوئی ظلم کرے تو فوراً اس کے خلاف کارروائی شروع کر دی جائے۔ آپ کی سنت یہ ہے کہ ظلم کے باوجود صبر واعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ عملی اقدام صرف اس وقت کیا جائے جب کہ اس کا نتیجہ خیز ہونا یقینی بن گیا ہو۔

مقام نزاع سے ہٹ جانا

پیغمبر اسلام ﷺ نبوت کے بعد تقریباً ۱۳ سال تک مکہ میں رہے۔ کچھ لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا مگر مکہ کی اکثریت آپ کی شدید مخالف بنی رہی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ صرف مخالفت آپ کے مشن کو ختم کرنے کے لئے کافی نہیں تو وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے قتل کے درپے ہوگئے۔ انھوں نے طے کیا کہ مکہ کے تمام سردار بیک وقت حملہ کر کے آپ کو قتل کر دیں۔ تاکہ آپ کی تحریک توحید کا خاتمہ ہو جائے۔

یہ ایک نازک موقع تھا۔ بظاہر ایک صورت یہ تھی کہ آپ اپنے ساتھیوں کو لیکر ان سے مقابلہ کریں۔ مگر آپ نے اس معاملہ کو نتیجہ کے اعتبار سے دیکھا چونکہ اس وقت کے حالات میں مسلح مقابلہ غیر مفید ہوتا اس لئے آپ نے اعراض کے اصول پر عمل فرمایا اور مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی سنت نزاع سے ٹکرانا نہیں ہے بلکہ نزاع کے مقام سے ہٹ جانا

ہے۔اس طرح آدمی کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو بچاکر انھیں زیادہ مفید طور پر استعمال کر سکے۔

اغیار کی رعایت

اسلام میں ایک مستقل اصول وہ ہے جس کو قرآن میں تالیف قلب کہا گیا ہے۔(التوبہ ٦٠) تالیف قلب کا مطلب ہے دلوں کو جوڑنا، لوگوں کو اپنے سے مانوس کرنا۔یہ مقصد صرف اس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے کہ دوسروں کی رعایت کی جائے۔دوسروں کے جذبات اور مفادات کا احترام کیا جائے۔ تالیف کا یہ اصول اسلامی دعوت کاایک اہم اصول ہے۔وہ ابدی طور پر ہر انسانی سماج میں مطلوب ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں تالیف قلب کے اس اصول پر عمل فرمایا۔ مثلاً جب آپ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو اس وقت وہاں اہل ایمان کے ساتھ مشرکین اور یہود بھی آباد تھے۔اس وقت آپ نے اپنی طرف سے ایک منشور جاری فرمایا جس کو عام طور پر صحیفۂ مدینہ کہا جاتا ہے۔اس میں آپ نے اعلان فرمایا کہ ہر گروہ کو اپنے مذہب اور کلچر کی آزادی ہو گی۔ہر قبیلہ کے نزاعی معاملات اس کی اپنی قبائلی روایات کے تحت طے کئے جائیں گے۔ عقیدہ اور کلچر کے معاملہ میں کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔

یہود کے ساتھ آپ نے خصوصی رعایت کا معاملہ فرمایا، رمضان کے روزہ کی فرضیت سے پہلے آپ بھی انھیں دنوں میں روزہ رکھتے رہے جب کہ یہود روزہ رکھتے تھے۔ تحویل قبلہ کا حکم آنے سے پہلے تقریباً سترہ مہینہ تک آپ نے یہود کے قبلہ (بیت المقدِس) کو اپنا قبلہ بنائے رکھا۔۔یہود کے قبلۂ عبادت کو اپنا قبلہ بنانا اس لئے تھا کہ آپ امید رکھتے تھے کہ اس طرح وہاں کے یہود آپ سے مانوس ہوں گے اور آپ کے قریب

آجائیں گے۔(تفسیر القرطبی ۲/۱۵۰)

پیغمبر اسلام ﷺ کا طریقہ مخالفت کے جواب میں مخالفت نہ تھا۔ بلکہ مخالفت کے جواب میں رعایت تھا۔ آپ کی سوچ یہ نہیں تھی کہ لوگوں کو دبا کر انھیں اپنا تابع بنائیں۔ اس کے برعکس آپ کا طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کے ساتھ شفقت اور رعایت کا معاملہ کیا جائے، ان کے دل کو نرم کر کے انھیں اپنا ساتھی بنایا جائے۔

رازداری

فتح مکہ کے واقعات کے ذیل میں آیا ہے کہ مدینہ میں آپ نے سفر کے لئے تیاری کا حکم دیا۔ عام مسلمان ضروری تیاری میں مصروف ہوگئے۔ اس زمانے میں حضرت ابو بکر صدیق اپنی صاحبزادی عائشہ کے گھر میں آئے جو پیغمبر اسلام ﷺ کی اہلیہ تھیں۔ وہ اس وقت ضروری تیاری کر رہی تھیں۔ حضرت ابو بکر صدیق نے اپنی صاحبزادی سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے تم کو اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ ہاں۔ حضرت ابو بکر صدیق نے دوبارہ پوچھا کہ یہ تیاری کہاں کے سفر کے لئے ہے۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم مجھ کو نہیں معلوم (واللہ ما ادری) سیرت ابن ہشام ۳/۱۴)

پیغمبر اسلام ﷺ کی سنتوں میں سے ایک سنت یہ تھی کہ آپ نازک معاملات میں ہمیشہ رازداری کا طریقہ اختیار فرماتے تھے۔۔ یہی آپ نے فتح مکہ کی مہم میں کیا۔ مدینہ سے آپ اپنے دس ہزار اصحاب کے ساتھ نکلے مگر آپ نے لوگوں کو یہ نہیں بتایا کہ ہم کہاں جارہے ہیں۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم چلتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جہاں سے راستہ سیدھا مکہ کی طرف جاتا تھا، اس وقت ہم نے جانا کہ یہ سفر مکہ کے لئے ہے۔

نازک اجتماعی معاملات میں رازداری بے حد اہم ہے اکثر اوقات کامیابی کا انحصار اس

پر ہوتا ہے کہ فریق ثانی کو آپ کے منصوبہ کا پیشگی علم نہ ہو سکے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس حکمت کو نہایت اہتمام کے ساتھ اپنی زندگی میں اختیار فرمایا۔

صورت موجودہ کو مان لینا

جب بھی دو آدمیوں یا دو گروہوں میں نزاع پیدا ہو تو بالآخر دونوں کے درمیان ایک عملی حالت قائم ہو جاتی ہے۔ جس کو اسٹیٹس کو (Status quo) کہا جاتا ہے۔ اس اسٹیٹس کو کو بدلنے کی کوشش اکثر حالات میں بے نتیجہ ہوتی ہے۔ کیونکہ فریق ثانی اپنی پوری طاقت کے ساتھ جوابی کارروائی کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صورت موجودہ (اسٹیٹس کو) بدستور باقی رہتی ہے۔ مزید نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس بے نتیجہ کوشش میں طرفین کے حاصل شدہ مواقع بھی بے فائدہ طور پر ضائع ہو جاتے ہیں۔

اس طرح کے نزاعی معاملہ میں پیغمبر اسلام کی سنت یہ ہے کہ موجودہ حالت (اسٹیٹس کو) کو مان لو۔ اس اسٹیٹس کوازم کا یہ عظیم فائدہ ہوتا ہے کہ آپ کو یہ فرصت مل جاتی ہے کہ اپنی قوتوں کو مزید استحکام میں لگا دیں۔ مقام نزاع سے ہٹ کر اپنے آپ کو اتنا مضبوط بنائیں کہ آخر کار طاقت کا توازن بدل جائے اور کسی بڑے ٹکراؤ کے بغیر معاملہ کا فیصلہ کیا جا سکے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر یہی حکمت اختیار فرمائی۔ آپ مدینہ سے روانہ ہو کر حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو مکہ کے لوگ بھی چل کر وہاں آ گئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو آگے جانے نہیں دیں گے۔ اس طرح حدیبیہ کے مقام پر ایک تعطل کی حالت پیدا ہو گئی۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسا نہیں کیا کہ اس تعطل کو توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں بلکہ آپ حدیبیہ ہی سے دوبارہ مدینہ واپس آ گئے۔

یہ گویا اپنے اور فریق ثانی کے درمیان قائم شدہ اسٹیٹس کو کو مان لینا تھا۔ اس حکمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیغمبر اسلام کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے آپ کو مزید مستحکم کر سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور صرف دو سال کے اندر آپ کے لئے مکہ میں فاتحانہ داخلہ ممکن ہو گیا۔

مشکل میں آسانی

پیغمبر اسلام ﷺ نے ۸ھ میں مکہ فتح کیا۔ اس کے بعد آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ سے طائف کے لئے روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں عرب میں ہموار سڑکیں نہیں تھیں۔ چلتے ہوئے ایک جگہ ایک تنگ راستہ آیا جو دو پہاڑیوں کے درمیان سے گذرتا تھا۔ چنانچہ یہ راستہ اپنی اسی صفت کے ساتھ مشہور ہو گیا تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ جب اس جگہ پہنچے تو آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ اس راستہ کا نام کیا ہے (ما اسم هذه الطريق) لوگوں نے جواب دیا کہ اس کا نام تنگ راستہ ہے (فقيل له الضيقة) آپ نے جواب دیا کہ نہیں، یہ ایک آسان راستہ ہے (فقال بل هي اليسرى) سیرت ابن ہشام ۴/۱۲۷)

اس وقت پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ دس ہزار سے زیادہ آدمی تھے۔ یہ لوگ اگر افقی انداز میں پھیل کر چلتے تو یقیناً ان کے لئے اس راستہ سے گذرنا مشکل ہوتا، ایسی حالت میں وہ ان کے لئے تنگ بن جاتا۔ لیکن یہی لوگ اگر قطار بنا کر چلیں تو ان کے لئے راستہ سے گذرنا مشکل نہ رہے گا، اور وہ بظاہر تنگی کے باوجود ان کے لئے عملی طور پر آسان ہو جائے گا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے جواب میں اسی عملی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا.

پیغمبر اسلام ﷺ کے اس واقعہ سے زندگی کا ایک اہم راز معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ حسب حالت تدبیر ہے۔ اس حکیمانہ تدبیر کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ اس

تدبیر کو استعمال کر کے زندگی کی ہر مشکل کو آسان بنایا جاسکتا ہے۔

تدبیری پسپائی

پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں ۸ھ میں ایک جنگ ہوئی۔ یہ شام کی سرحد پر موتہ کے مقام پر ہوئی اسی نسبت سے اس کو جنگ موتہ کہا جاتا ہے۔ اس جنگ کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔ اس کے مقابلہ میں فریق ثانی کی فوجی تعداد غیر متناسب طور پر بہت زیادہ تھی۔ آخری مرحلہ میں خالد بن الولید اس کے سردار مقرر ہوئے انھوں نے لڑائی کو غیر مفید سمجھ کر واپسی کا فیصلہ کیا۔ وہ تدبیری پسپائی (Tactical retreat) کے اصول پر موتہ سے واپس ہو کر مدینہ چلے گئے۔

عربوں کا مزاج لڑنے مرنے کا مزاج تھا۔ وہ اس پسپائی کی حکمت کو سمجھ نہ سکے۔ چنانچہ جب وہ مدینہ پہنچے تو وہاں کے نوجوانوں نے یا فرار کہہ کر ان کا استقبال کیا۔ یعنی اے بھاگنے والو۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کو سنا تو آپ نے اس کی تردید فرمائی۔ آپ نے کہا کہ یہ لوگ بھاگنے والے نہیں ہیں بلکہ خدا نے چاہا تو وہ اقدام کرنے والے ہیں۔ (**لیسوا بالفرار ولکنهم الکرار انشاء الله تعالى**) (سیرت ابن ہشام ۴۳۸/۳)

پیغمبر اسلام ﷺ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک صحیح اقدام وہ ہے جو نتیجہ خیز ثابت ہو سکے۔ محض جوش اور وقار کے لئے لڑ کر مر جانا کوئی مطلوب اسلامی کام نہیں۔ اگر اہل ایمان کے مقابلے میں فریق ثانی کی طاقت فیصلہ کن حد تک زیادہ ہو تو ایسی حالت میں مقابلہ کے لئے اقدام نہیں کیا جائے گا۔ حتی کہ اگر مقابلہ پیش آجائے تو تدبیری پسپائی اختیار کی جائے گی۔ تاکہ مزید تیاری کر کے اپنے آپ کو نتیجہ خیز اقدام کے قابل بنایا جاسکے۔

اصلاح میں تدریج

ایک روایت کے مطابق، حضرت عائشہ نے فرمایا کہ قرآن میں سب سے پہلے وہ آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت کا اور جہنم کا ذکر تھا۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوگئے تو اس کے بعد حلال و حرام کے احکام اترے۔ اور اگر ایسا ہوتا کہ شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ تم لوگ شراب نہ پیو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اسی طرح اگر شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے۔ (صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، بحواله فتح الباری ،۸/۶۵۵)

اس روایت سے ایک عظیم حکمت نبوی معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہی عملی حکمت ہے جس کو تدریج (Graduation) کہا جاتا ہے۔ انسان کی اصلاح ایک مشکل اور پیچیدہ کام ہے۔ انسان عام طور پر کچھ خیالات اور عادات سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ وہ اسی کو درست سمجھنے لگتے ہیں۔ اس بنا پر وہ کسی نئی چیز کو فوری طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ایسی حالت میں انسانوں کی اصلاح کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کام کو حکمت اور تدریج کے ساتھ کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے عرب میں پہلے لوگوں کی سوچ کو بدلا۔ لوگوں کے اندر قبولیت کا مزاج پیدا کیا۔ یہاں تک کہ جب ان کے اندر اصلاح کو قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو گئی تو اس کے بعد آپ نے شرعی احکام کا نفاذ فرمایا۔ اگر آپ فکری تطہیر اور مزاج سازی کے بغیر شریعت کے قوانین نافذ کرتے تو یہ انسانی فطرت کے خلاف ہوتا، اور وہ انقلابی نتیجہ بر آمد نہ ہوتا جو عرب کے سماج میں بر آمد ہوا۔

عملی حالات کی رعایت

پیغمبر اسلام ﷺ نے ذی الحجہ ۹ھ میں حج کا فریضہ ادا فرمایا۔ اس کو عام طور پر حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان اکٹھا تھے۔ آپ نے اپنے خطبہ میں جو باتیں فرمائیں ان میں سے ایک وہ تھی جس کو انسانی مساوات کا اعلان کہا جاسکتا ہے۔ آپ نے اس موقع پر یہ تاریخی الفاظ فرمائے کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں، کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر فضیلت نہیں۔ فضیلت کا تعلق صرف دین اور تقوی سے ہے۔

اس خطبہ کے تقریباً ڈھائی ماہ بعد مدینہ میں آپ کی وفات ہو گئی۔ آپ کی وفات کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ کس کو خلیفہ بنایا جائے۔ مذکورہ اعلان کے مطابق بظاہر صرف یہ ہونا چاہئے تھا کہ دین اور تقوی کی بنیاد پر خلافت کا فیصلہ کیا جائے نہ کہ نسل اور قبیلہ کی بنیاد پر۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہوا۔

آپ کی وفات کے بعد مدینہ کی ایک چوپال (ثقیفہ بنی ساعدہ) میں مسلمانوں کا اجتماع ہوا۔ لوگوں کا پہلا رجحان یہ تھا کہ سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنایا جائے جو مدینہ کے ایک قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وقت حضرت ابو بکر صدیق نے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث پیش کی کہ الائمۃ من قریش۔ یعنی خلیفہ یا امام قریش سے ہو گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سعد بن عبادہ چونکہ قبیلہ قریش سے نہیں ہیں اس لئے ان کو خلیفہ نہیں بنایا جاسکتا۔ کسی قدر بحث کے بعد آخر کار لوگوں کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ قبیلہ قریش ہی کے کسی شخص کو خلیفہ بنایا جائے۔ اس کے مطابق حضرت ابو بکر صدیق خلیفہ اول مقرر ہوئے جو کہ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔

بظاہر یہ ایک متضاد بات ہے۔ پھر پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسا کیوں فرمایا۔ اس کے

پیچھے ایک عظیم حکمت تھی۔ وہ یہ کہ خلیفہ یا حکمراں کو ایک وسیع انسانی سماج پر احکام کا نفاذ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ لوگ خلیفہ کی اطاعت پر راضی ہو جائیں۔ یہ اطاعت رضاکارانہ ہونا چاہئے۔ جبری اطاعت کے ذریعہ وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جو اسلامی خلافت کا مقصود ہے۔

قدیم عرب میں سیکڑوں سال کی تاریخ کے نتیجہ میں قریش کے لوگوں کو سرداری کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ عوامی نفسیات کسی ایسے شخص کی سیادت کو آسانی کے ساتھ قبول کرلیتی تھی جس کا تعلق قریش کے قبیلہ سے ہو۔ اسی سماجی صورت حال کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ الائمۃ من قریش۔ یہ کوئی ابدی حکم نہیں تھا۔ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ کسی قوم میں جس گروہ کو قریش جیسی سیاسی حیثیت حاصل ہو جائے، وہاں اسی گروہ کے کسی فرد کو قوم کے اوپر حاکم بنایا جائے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عملیت (Pragmatism) بھی رسول اللہ ﷺ کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ انفرادی معاملہ میں ایک شخص کو ہمیشہ نظری معیار سامنے رکھنا چاہئے۔ مگر اجتماعی معاملات میں بعض اوقات نظری معیار قابل عمل نہیں ہوتا، اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایسے معاملہ میں نظری معیار کو چھوڑ کر عملی تقاضے کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو زندگی کا نظام ہموار طور پر نہیں چل سکتا۔

مستقبل بینی

فتح مکہ کے بعد عرب میں وہ دور آیا جس کو تاریخ میں عام الوفود کہا جاتا ہے۔ عرب کے قبائل مدینہ آکر اسلام قبول کرنے لگے۔ ان میں سے ایک قبیلہ ثقیف بھی تھا جو طائف سے آیا تھا۔ یہ لوگ مدینہ آئے تو انھوں نے ایک انوکھی شرط پیش کردی۔ انھوں نے کہا کہ

ہم اسلام تو قبول کرلیں گے لیکن ہم نہ زکوٰۃ دیں گے اور نہ جہاد کریں گے۔

یہ ایک نازک مسئلہ تھا۔ عام لوگ اس قسم کے اسلام کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے حال سے اوپر اٹھ کر مستقبل کو دیکھا۔ آپ نے اپنی بصیرت کے تحت یہ سمجھا کہ یہ لوگ جب اسلام میں داخل ہو کر مسلم معاشرہ کا جزء بن جائیں گے تو وہ اپنے آپ سب کچھ کرنے لگیں گے۔ چنانچہ آپ نے ان کی شرطوں کو مانتے ہوئے انھیں اسلام میں داخل کرلیا۔ لوگوں کے اشکال کو رفع کرنے کے لئے آپ نے فرمایا کہ جب وہ اسلام قبول کرلیں گے تو اس کے بعد وہ زکوٰۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔ (**سیتصدقون و یجاھدون اذا اسلموا**) سیرت ابن کثیر ۴/۵۶۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے اس اسوہ سے ایک عظیم حکمت معلوم ہوتی ہے۔ یہ حکمت ایک لفظ میں مستقبل بینی ہے۔ انسان کوئی پتھر نہیں ہے جو تاثر کو قبول نہ کرے۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ انسان کے حال پر اس کے مستقبل کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ آدمی سے معاملہ کرتے ہوئے ہمیشہ اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہئے۔ بوقت معاملہ فوری تبدیلی پر اصرار سے ضد پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر وسعت ظرف کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اپنے آپ ایسا ہوگا کہ آدمی مستقبل میں عین وہی بن جائے گا جیسا کہ حال میں ہم دیکھنا چاہتے تھے۔

زیر طبع کتاب مطالعۂ سیرت کا ایک باب (صفحات ۲۰۸)

سوال

باتیں دو طرح کی ہوتی ہیں یا مسائل، نظریات دو طرح کے ہوتے ہیں: (۱) منصوصات (۲) مستنبطات اول الذکر میں کسی کو اختلاف کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ البتہ مستنبطات، یا مستخرجات میں دائرہ اختلاف وسیع سے وسیع تر ہوتا ہے۔

سلف صالحین، ائمہ مجتہدین، محدثین تقریباً سبھوں نے اپنے فکر پر دلائل کے ساتھ قائم رہتے ہوئے اپنے مخالف کے بارے میں اس طرح اعلان کیا ہے: نحن علی الصواب مع احتمال الخطاء، انتم علی الخطأ مع احتمال الصواب۔ اور یہ کہ غیر منصوصات پر اصرار کی ایک جانب غیر شرعی چیز ہونے پر فقہاء امت کا تقریباً اتفاق ہے۔

ہر صاحب فکر جسے اللہ نے فکر مستقل سے نوازا ہوا سے یہ اعلان کر دینا چاہئے کہ انا علی الصواب مع احتمال الخطأ، انت علی الخطأ مع احتما ل الصواب۔ اختیار حق اور احقاق کے لئے راستہ صاف ہے۔ (سید احمد اللہ بختیاری، حیدر آباد)

جواب

راقم الحروف کی تحریریں زیادہ تر منصوصات سے متعلق ہوتی ہیں نہ کہ مستنبطات سے متعلق۔ ایسی حالت میں ان تحریروں پر مذکورہ قسم کے احتمال کا اصول چسپاں نہیں ہوتا۔ مثلاً میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان کی حیثیت داعی کی ہے اور غیر مسلموں کی حیثیت مدعو کی۔ یہ یقینی طور پر نص کا مسئلہ ہے نہ کہ استنباط کا مسئلہ۔

موجودہ زمانہ میں کچھ مسلم رہنما اور مسلم اخبارات ملی مسائل کو لے کر بار بار ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ٹکراؤ کا ماحول پیدا ہو۔ اس کے مقابلہ میں راقم الحروف کا کہنا یہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کا تعلق داعی اور مدعو کا تعلق ہے۔ اس نسبت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے معاملات میں غیر مسلموں سے نزاع کو اوائڈ کریں تاکہ وہ معتدل ماحول قائم ہو جس میں دعوت کا پر امن عمل جاری رہ سکے۔ یہ نظریہ صراحۃً نص قرآنی پر مبنی ہے۔ مثلاً فلا ینازعنک فی الامر و ادع الی ربک (الحج ۶۷)۔ ایسی حالت میں اس مسئلہ کو

بیان کرتے ہوئے مجھے یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ: **رایی صواب یحتمل الخطاء ورای غیری خطأ یحتمل الصواب۔**

یہی ہمیشہ خود علماء امت کا موقف رہا ہے۔ وہ مذکورہ قسم کے جملے صرف مستنبطات کے بیان میں لکھتے ہیں نہ کہ منصوصات کے بیان میں۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ یہ دعوی کرتے ہیں کہ اسلام میں نماز پانچ وقت کی نہیں ہے بلکہ صرف دو وقت یا تین وقت کی ہے۔ اس کے مقابلہ میں جب علماء صالحین اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام میں رات اور دن کے درمیان پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں تو وہ ایسا نہیں کرتے کہ اپنے مضمون کے آخر میں یہ لکھیں کہ: **نحن علی الصواب مع احتمال الخطأ و انتم علی الخطأ مع احتمال الصواب۔**

البتہ کچھ دوسرے قسم کے مسائل جن کی بنیاد نص پر نہیں ہے بلکہ استنباط پر ہے، ان کے بیان میں علماء مذکورہ قسم کا اعتراف درج کرتے ہیں۔ مثلاً علماء کا ایک طبقہ اگر یہ اصرار کرے کہ جراب پر مسح کی اجازت صرف اس جراب کے لئے ہے جو قدیم طریقہ کے مطابق چمڑے سے بنایا گیا ہو۔ اب دوسرا عالم اگر یہ کہے کہ صنعتی ریشوں سے بنے ہوئے جدید طرز کے موزوں کا بھی وہی حکم ہے اور ان پر بھی مسح جائز ہے، تو اپنے اس بیان کے ساتھ بطور احتیاط وہ مذکورہ قسم کے احتمالی الفاظ لکھ سکتا ہے، کیوں کہ یہ دوسری قسم کا بیان استنباط پر مبنی ہے نہ کہ براہ راست نص پر۔ میں ایسے موقع پر "غالباً" جیسا کوئی لفظ استعمال کرتا ہوں۔

میری تحریروں کا دوسرا اجزء وہ ہے جس کا تعلق جدید حالات کی نسبت سے تدبیر کار پر ہے۔ مثلاً پر تشدد جدو جہد کے مقابلہ میں پر امن جدو جہد۔ جلسہ جلوس کے طریقہ کے بجائے گفت و شنید کا طریقہ، اختلافی معاملات میں محاذ آرائی کے بجائے حکیمانہ انداز، خارجی اقدام سے پہلے داخلی تیاری، وغیرہ۔

یہ دوسری باتیں بھی اپنی اصل کے اعتبار سے منصوصات پر مبنی ہیں۔ البتہ چونکہ ان کا تعلق خارجی حالات سے ہے اور خارجی حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان باتوں پر انطباق

(application) کے اعتبار سے، ایک سے زیادہ رائیں ہو سکتی ہیں۔ اس پہلو سے ایک شخص یہ حق اختلاف رکھتا ہے کہ وہ دلائل کے ذریعہ یہ بتائے کہ حالات کی نوعیت اس کے نزدیک اس سے مختلف ہے جو میں نے اپنے مطالعہ سے سمجھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے معاملات میں خود سنت رسول میں مختلف نمونے پائے جاتے ہیں۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مشرکین سے جنگ کی انہی مشرکین سے حدیبیہ کے موقع پر آپ نے صلح کرلی۔ اسی طرح آپ نے احد کے موقع پر مدینہ سے تین میل باہر جا کر مخالفین سے مقابلہ کیا اور پھر احزاب کے موقع پر انہیں مخالفین سے مدینہ کے اندر رہ کر دفاع کیا، وغیرہ۔ اس لئے شریعت کا یہ متفقہ اصول ہے کہ: **تتغیر الاحکام بتغیُّر الزمان و المکان۔**

تدبیر کار سے متعلق میری جو تحریریں ہیں وہ اسی آخری نوعیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان تحریروں میں مسلمانوں کو جو مشورہ دیا جاتا ہے اس کے ردّو قبول کی بنیاد یہ ہے کہ حالات کا بے لاگ مطالعہ کر کے ان کی حقیقی نوعیت کو سمجھا جائے۔ اور پھر یہ دیکھا جائے کہ قرآن و سنت کے کون سے احکام ان حالات پر منطبق ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں اگر کسی کو مجھ سے اختلاف ہو تو اس کو الزام تراشی اور بہتان طرازی کے بجائے دلائل اور تجزیہ کی زبان میں بتانا چاہئے کہ میرے نقطۂ نظر کے بجائے دوسرا نقطۂ نظر قرآن و سنت سے کیوں اس کے نزدیک زیادہ قریب ہے۔

سوال

تبلیغی جماعت کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے۔ وہ ہر جگہ کافی مقبول ہو رہی ہے۔ اس کی اس مقبولیت کا راز کیا ہے۔ (عمر فاروق، نیویارک، بذریعہ ٹیلی فون)

جواب

تبلیغی جماعت کے ذریعہ امت کو کچھ فائدے مل رہے ہیں۔ مثلاً مسجد کے نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہونا۔ اس لحاظ سے وہ قابل قدر ہے۔ مگر تبلیغی جماعت کا طریقہ ایک اجتہادی طریقہ ہے وہ کوئی منصوص طریقہ نہیں۔ ان کے جلسوں میں قرآن کے بجائے فضائل کی

روایتیں سنائی جاتی ہیں جو اکثر سند کے اعتبار سے غیر معتبر ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان کے یہاں کرامت کے قصوں اور کہانیوں کی کثرت ہے جو بے بنیاد بھی ہوتے ہیں اور غیر مسنون بھی، جہاں تک اس کام کی مقبولیت کا معاملہ ہے تو اس کی مقبولیت کا راز زیادہ تر یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے سارے معاملہ کو ایک سمپل روٹین میں ڈھال دیا ہے:

They have reduced Islam to a simple routine.

سوال

آپ کے لفظ (جہاد) کی تعریف میں منسلکات روانہ کئے جارہے ہیں۔ تفصیل اور صبر کے ساتھ پڑھ کو جواب دو۔ قرآن کو خدائی کتاب کہنے والا انسانیت کا دشمن ہے اور سرودھرم سمبھاو کا بھی دشمن ہے۔ (شیوا گوڑ)

Shiva Goud, B.A. L.L.B. Advocate,
H. No. 6-6-204, Sangareddy-502001

جواب

شیوا گوڑ صاحب نے اپنے اس مکتوب کے ساتھ ہمیں انگریزی میں ۱۴ صفحہ کی فوٹو کاپیاں بھیجی ہیں۔ اس کے دو حصے ہیں۔ دونوں کا جواب یہاں تحریر کیا جاتا ہے۔

۱۔ آپ نے اپنے مکتوب میں قرآن کی ۲۴ آیتیں نقل کی ہیں جن میں اس طرح کی باتیں ہیں کہ ـــــ ان سے لڑو، ان سے دوستی نہ کرو، ان کے ساتھ نرمی سے نہ پیش آؤ۔ ان کے خلاف جہاد کرو، وغیرہ۔ واضح ہو کہ قرآن کی یہ آیتیں جو آپ نے نقل کی ہیں وہ غیر مسلم کے ساتھ مسلمان کے تعلق کو نہیں بتاتیں۔ بلکہ وہ دشمن کے ساتھ مسلمان کے تعلق کو بتاتی ہیں۔ اور کسی کھلے دشمن کے معاملہ میں یہی ساری دنیا کا مسلمہ اصول ہے۔

ان آیتوں کی بنیاد پر آپ نے اسلام کے بارے میں جو شدید رائے قائم کی ہے، وہ سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ آپ نے قرآن کی مذکورہ آیتوں کو عمومی معنوں میں لے لیا ہے۔ حالانکہ یہ آیتیں ہنگامی حالات کے لئے ہیں۔ یہ اس وقت کے لئے ہیں جب کہ مسلمانوں اور دوسری قوم کے درمیان حالت جنگ (state of war) قائم ہو گئی ہو۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ

حالت جنگ میں ہمیشہ ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ جہاں تک نارمل حالات میں لوگوں کے ساتھ مسلمان کے سلوک کا تعلق ہے، وہ دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے جو قرآن میں کثرت سے موجود ہیں۔ ان دوسری آیتوں میں مسلمانوں کو لوگوں کے درمیان مرحمت کے ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا ہے (البلد ۱۷) اسی طرح حکم ہے کہ لوگوں کے ساتھ عدل کا سلوک کرو (المائدہ ۴۲) اسی طرح فرمایا کہ لین دین میں ترازو کی طرح برابری کا معاملہ کرو (الرحمٰن ۹) وغیرہ، وغیرہ۔

جہاں تک غیر مسلموں سے تعلق کا معاملہ ہے، قرآن میں اس کی بابت ایک بنیادی اصول مقرر کر دیا گیا ہے۔ جس سے انحراف مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔ وہ یہ ہے : فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم ان اللہ یحب المتقین (التوبہ ۸) یعنی جب تک وہ تمہارے ساتھ مستقیم رہیں تم بھی ان کے ساتھ مستقیم رہو اور اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔ بین اقوامی معاملات میں یہی مساویانہ اصول ساری دنیا کا مسلمہ اصول ہے اور اسلامی شریعت میں بھی مساویانہ سلوک کے اسی اصول کو اختیار کیا گیا ہے۔

واضح ہو کہ قرآن بیک وقت ایک واحد کتاب کی صورت میں نہیں اترا، بلکہ وہ حالات کے اعتبار سے ۲۳ سال کے دوران اترا۔ ۲۳ سال کی اس مدت کو عمومی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک، ۲۰ سال۔ دوسرے، ۳ سال۔ ۲۳ سالہ مدت نزول میں ۲۰ سال گویا امن کے سال تھے اور تقریباً ۳ سال جنگی حالات کے سال۔ آپ نے جن ۲۴ آیتوں کا حوالہ دیا ہے وہ مذکورہ تقسیم کے مطابق، ۳ سال والے حالات میں اتریں۔ قرآن کی دوسری آیتیں ۲۰ سال والی مدت میں اتریں اور وہ سب کی سب امن اور انصاف اور انسانیت جیسی مثبت تعلیمات پر مشتمل ہیں۔

۲۔ مکتوب نگار نے دوسری بات جو لکھی ہے وہ حدیث پر مبنی ہے۔ انہوں نے صحیح مسلم کے انگریزی ترجمے کے کئی صفحات بھیجے ہیں۔ ان میں ایک حدیث وہ ہے جو صحیح مسلم (کتاب الایمان، کتاب الزکاۃ) میں آئی ہے۔ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں: من مات لا یشرك باللہ شیئا دخل الجنة فقلت یا جبریل و إن سرق وإن زنی... قال نعم وإن شرب الخمر (جو اس

حال میں مرا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کرتا تھا تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ میں نے جبریل سے کہا کہ اگرچہ اس نے چوری کی، اگرچہ اس نے زنا کیا.... انہوں نے کہا کہ ہاں، اگرچہ اس نے شراب پیا)

اس حدیث کے بارے میں مکتوب نگار کی منفی رائے بھی صرف غلط فہمی پر مبنی ہے۔ انہوں نے غالباً اس کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ مومن خواہ عادۃً چوری کرتا رہے، زنا کرتا رہے، شراب پیتا رہے، پھر بھی وہ جنت میں جائے گا۔ حالانکہ حدیث کا یہ مطلب نہیں۔ حدیث کا یہ مفہوم لینا اس وقت درست ہوتا جب کہ اس میں یسرق اور یزنی اور یشرب کے الفاظ ہوتے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کے بجائے حدیث میں وإن سرق و إن زنى و إن شرب کے الفاظ ہیں۔ یعنی حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک شخص اگر استمراری طور پر سرقہ زنا اور شراب نوشی جیسے افعال میں مبتلا ہو تب بھی وہ جنت میں داخل ہوگا۔ بلکہ حدیث میں ماضی کا صیغہ ہے۔ یعنی ماضی میں یا اتفاقاً اس سے یہ افعال ہو گئے تھے، پھر اس نے توبہ کر کے پاکیزہ زندگی اختیار کر لی تو وہ جنت میں جائے گا۔ اس حدیث میں فعل اتفاقی کا ذکر ہے نہ کہ فعل جاری کا۔

اس حدیث میں عین وہی بات کہی گئی ہے جو صحیح مسلم اور دوسری کتابوں میں مختلف الفاظ میں آئی ہے۔ اصل یہ ہے کہ دور اول میں جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا ان میں کئی لوگ ایسے تھے جن سے ماضی میں ایسے افعال سرزد ہوئے تھے جو شریعت اسلامی کے خلاف تھے۔ ان کو اپنی ماضی کی اس غلطی کا شدید احساس ہوتا تھا۔ چنانچہ ان میں سے کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ آپ نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اسلام پچھلے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے (الاسلام یهدم ما کان قبله)۔

سوال

میں 1991 سے الرسالہ کا مستقل قاری ہوں۔ الرسالہ کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کو ایک مخصوص خول سے نکال کر ایک وسیع النظر انسان بناتا ہے۔ الرسالہ پڑھنے کی وجہ سے میں اب ہر مکتب فکر کو پڑھنے لگا ہوں۔ میرے اندر جو ذہنی بزدلی تھی وہ الرسالہ کے پڑھنے سے دور

ہو گئی۔ ابھی کچھ دن ہوئے میں مرزائیت کے متعلق غلام احمد پرویز کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ تو ایک دوست نے کہا کہ غلام احمد پرویز کو تو علماء نے کافر بتایا ہے۔ پھر تم کیوں اس کی کتاب پڑھتے ہو۔ اس معاملہ کی وضاحت فرمائیں۔ (ایک قاری الرسالہ)

جواب

جہاں تک کتاب کا تعلق ہے، میرے نزدیک ہر کتاب کو پڑھنا چاہئے۔ البتہ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی عقل کو اتنا بیدار رکھے کہ وہ صحیح اور غلط میں فرق کر سکے۔ تکفیر کا موجودہ طریقہ بعد کے زمانہ کی ایک ایجاد ہے۔ وہ اسلام کے مطابق نہیں۔ مصر کے ایک عالم خالد العنبری کی ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام یہ ہے: هزيمة الفكر التكفيرى۔ اس کے مصنف نے موجودہ طرز تکفیر کو غیر صحیح بتایا ہے۔ اس کتاب کی رد میں سعودی عرب کے ایک عالم الشیخ صالح بن فوزان کا ایک مضمون ریاض کے عربی مجلہ الدعوۃ (۴ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ۔ ۶ جولائی ۲۰۰۰) میں چھپا ہے۔ شیخ موصوف نے تکفیر کے طریقہ کو درست قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے قرآن وحدیث سے دو حوالے نقل کئے ہیں۔ ایک، منافقین مدینہ کے بارے میں قرآن کا یہ ارشاد کہ: قد کفرتم بعد ایمانکم (التوبہ ٦٦) اسی طرح حدیث سے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ: بين العبد و بين الكفر ترك الصلوة۔

شیخ مذکور کا یہ استدلال درست نہیں۔ انہوں نے دو چیزوں میں فرق نہیں کیا۔ اصل یہ ہے کہ مذکورہ آیت یا حدیث عمومی اظہار ناراضگی کی مثال ہے نہ کہ شخصی تکفیر کی مثال۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن میں مدینہ کے جن منافقین کے بارے میں "کفر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہ بڑی تعداد میں وہاں موجود تھے۔ مگر اس آیت کے نزول کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے افراد کا نام لے کر مشخص انداز میں کبھی ان کی تکفیر نہیں کی۔ اسی طرح حدیث میں ترک صلاۃ کے بارے میں "کفر" کا لفظ آیا ہے۔ مگر اس سے مراد مشخص تکفیر نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہر زمانہ میں بہت سے مسلمان ایسے رہے ہیں اور آج بھی ہیں جو نماز کے تارک ہیں مگر علماء اسلام نے کبھی شخصاً شخصاً نام لے کر ان کی تکفیر نہیں کی۔

ہیں کہ اپنی طبیعت کے اعتبار سے اس قسم کی دنیوی آسائشوں سے میں آخری حد تک بیزار ہوں۔ مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ مئی۔جون کے سورج کی گرمی میرے کمرے میں داخل ہو تو اس کے تجربہ سے مجھے نار جہنم یاد آئے اور میں بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ پکار اٹھوں کہ اے میرے رب، مجھے جہنم کی شدید تر گرمی سے بچا۔ کولر اور اے سی کی مصنوعی ٹھنڈک سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کے مقابلہ میں مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میرے کمرہ کی کھلی کھڑکی سے ہوا کا جھونکا میرے کمرے میں داخل ہو جو مجھے لمس ربانی کے تجربہ سے آشنا کرے۔ میں اپنی تنہائیوں میں اکثر اس قولِ رسول کو دہراتا ہوں: اللھم لا عیش الا عیش الآخرۃ۔ میرا عمل خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کی اس نصیحت پر ہے جو انہوں نے ان الفاظ میں فرمائی تھی: اخشوشنوا۔ (لسان العرب ۱۳/۱۴۰)

سوال

سورہ الاعراف میں یہود کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: واذ تاذن ربك ليبعثن عليهم إلى يوم القيامة من يومهم سوء العذاب إن ربك لسريع العقاب وانه لغفور رحيم (۱۶۷)۔ اس آیت کی تشریح کیا ہے۔ براہ کرم جواب تحریر فرمائیں۔ (سید حلیم، ینبع، سعودی عرب)

اس آیت کی مفصل تشریح تذکیر القرآن (جلد اول، صفحہ ۴۱۹-۴۱۸) میں ملاحظہ فرمائیں۔ خلاصہ یہ کہ اس آیت سے مراد استمراری عذاب نہیں ہے۔ خود قرآن کے مطابق، ان پر حسنات (الاعراف ۱۶۸) کے وقفے آتے رہیں گے، اور یہود کی تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس آیت کا تعلق جس طرح یہودیوں سے ہے اسی طرح اس کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔ وہ یہود کے لئے تہدید ہے اور مسلمانوں کے لئے تنبیہ۔ اللہ کا یہ قانون صرف یہود کے لئے نہیں تھا۔ وہ بعد کے اس گروہ کے لئے بھی ہے جس کو یہود کی معزولی کے بعد خدا کی گواہی کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ مسلمان اگر اپنے کو اس حال میں پائیں کہ وہ غیر مسلم قوموں کی چیرہ دستی کا شکار ہو رہے ہوں اور ان کی جمعیت چھوٹے چھوٹے جغرافیوں میں بٹ کر متفرق ہو گئی ہو تو ان کو خدا کی طرف لوٹنا چاہئے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ احتساب الٰہی کی اسی زد میں آگئے ہیں جس میں یہود آئے۔

ایک خط

محترمہ صوفیہ حیدر صاحبہ   السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا خط مورخہ ۱۸ ستمبر ۲۰۰۰ ملا۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ کے دینی شعور اور دینی جذبات میں ترقی ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ مزید توفیق عطا فرمائے۔

ایمان رسمی عقیدہ کا نام نہیں۔ ایمان دراصل ایک دریافت (ڈسکوری) ہے۔ کسی عورت یا مرد کے اوپر جب شعوری طور پر یہ حقیقت منکشف ہو کہ اس دنیا کا ایک زندہ خالق ہے جس نے اس کو وجود بخشا ہے تو اسی دریافت کا نام ایمان ہے۔ یہ ایمان یا انکشاف جتنا گہرا ہو، اتنا ہی زیادہ اس کے اثرات صاحب انکشاف کی زندگی میں ظاہر ہوں گے۔ شعوری ایمان کی پہچان یہ ہے کہ انسان کی سوچ میں انقلاب آجائے۔ اس کی پسند اور ناپسند کا معیار بدل جائے۔ اس کی روح کی گہرائیوں میں اللہ کی یاد اس طرح سما جائے کہ ہر واقعہ اور ہر تجربہ اس کو اللہ کی یاد دلانے والا بن جائے۔

یہ ایمان کوئی جامد چیز نہیں۔ وہ درخت کی مانند ایک اضافہ پذیر چیز ہے۔ جب کسی کو اللہ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو اس کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ اللہ کے پڑوس میں پہنچ گیا ہے، وہ اپنے آپ کو روحانی طور پر اللہ کے قریب محسوس کرنے لگتا ہے۔ حتی کہ اس کا وہ حال ہو جاتا ہے جس کو حدیث میں یناجی ربّہ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ سے اس کی سرگوشیاں ہونے لگتی ہیں۔ وہ اللہ کو پکارتا ہے۔ اور اللہ کی طرف سے وہ اس کا جواب پاتا ہے (ادعونی استجب لکم)۔

اس سلسلہ میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ اللہ کی معرفت کا نہایت گہرا تعلق علم سے ہے۔ فارسی کا ایک شعر بالکل درست ہے: کہ بے علم نتواں خدا را شناخت (علم کے بغیر خدا کو پہچانا نہیں جا سکتا)۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنا زیادہ علم اتنی ہی زیادہ معرفت۔ اس لئے جو عورت یا مرد اعلیٰ ایمان حاصل کرنا چاہے، اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے علم کو بڑھائے۔

علم سے مراد نہ رسمی علم ہے اور نہ محض معلومات۔ علم سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنے شعور کو اتنا بڑھائے کہ وہ قرآن وحدیث کی سطور کے ساتھ وہ اس کے بین السطور (between the lines) کو بھی پڑھنے لگے۔ وہ کائنات کے مظاہر میں چھپی ہوئی اللہ کی نشانیوں کا ادراک کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس کا شعور اتنا زیادہ بیدار ہو جائے کہ وہ دنیا میں پیش آنے والے تجربات اور واقعات میں ربانی سبق اور نصیحت اخذ کرنے لگے۔ علم سے سنجیدگی آتی ہے اور سنجیدگی سے معرفت کے دروازے کھلتے ہیں۔

علم کس طرح معرفت میں اضافہ کا سبب بنتا ہے، اس کی ایک مثال لیجئے۔ سجدہ ایک اعلیٰ ترین عبادت ہے۔ سجدہ کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی سادہ طور پر اس احساس کے ساتھ سجدہ کرے کہ اس نے رب العالمین کے سامنے اپنا سر زمین پر رکھ دیا ہے۔ اس قسم کا سجدہ بھی ایک عظیم عبادت ہے۔ مگر اس سے زیادہ عظیم وہ سجدہ ہے جس میں علم وشعور کا سرمایہ شامل ہو گیا ہو۔ یہ دوسرا سجدہ جو علم کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ سجدہ کی عبادت کو بہت زیادہ عظیم بنا دیتا ہے۔

مثلاً ایسے شعور والا آدمی جب زمین پر اپنا سر رکھے گا تو وہ تصور کرے گا کہ وہ ایک ایسے کرہ (Planet) کے اوپر حالت سجدہ میں ہے جو اپنے محور اور اپنے مدار پر بیک وقت دو قسم کی گردش کرتا ہوا سورج کے دہکتے ہوئے الاؤ کے گرد اتھاہ خلا میں گھوم رہا ہے۔ پھر یہ پورا شمسی نظام ایک وسیع تر کہکشاں کی پلیٹ پر نہایت تیز رفتاری کے ساتھ حالت گردش میں ہے۔ اس طرح کی بہت سی کہکشائیں انگنت ستاروں اور سیاروں کے ساتھ ایک غیبی مرکز کائنات کے گرد نا قابل شمار حد تک وسیع فاصلوں کے دائرہ میں رواں دواں ہیں۔ یہ آفاقی تصور سجدہ کرنے والے کی شخصیت کو ہیبت ناک حد تک ہلا دے گا، وہ اس کے سجدہ کو کائنات کا سب سے زیادہ عظیم واقعہ بنا دے گا۔

علم کیا ہے۔ ابتدائی مفہوم میں علم کا مطلب یہ ہے کہ مختلف ذرائع سے اپنی معلومات میں اضافہ کیا جائے۔ کوئی عورت یا مرد اپنی معلومات میں جتنا زیادہ اضافہ کرے اتنا ہی زیادہ اس کو صاحب علم کہا جائے گا۔

مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے علم کا مقصد صرف صاحب معلومات بننا نہیں ہے بلکہ اس کا

مقصد صاحب بصیرت بننا ہے۔ کسی نے درست طور پر کہا ہے:

You will need information to back up your ideas.

معلومات کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ کسی عورت یا مرد کو تیار ذہن (prepared mind) بناتی ہے۔ جب اس کے ساتھ غور وفکر (thinking) کا عنصر شامل ہو جائے تو اس کے بعد وہ حضرت علی ابن ابی طالب کے قول کے مطابق اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ چیزوں کو ان کے واقعی اور اصلی مقام پر رکھ سکے (العاقل هو الذی یضع الشیء موضعه)۔

دنیا کی بیشتر فکری اور عملی خرابیاں اسی لئے پیدا ہوتی ہیں کہ لوگ چیزوں کو اس کے اصل مقام پر رکھ کر دیکھ نہیں پاتے۔ اس بنا پر ان کا فیصلہ غلط ہو جاتا ہے اور ان کی منصوبہ بندی بھی غلط۔

اس دنیا میں کامیاب عورت یا مرد وہ ہے جس کو دنیا میں اللہ سے محبت اور خوف اور قربت کی غذائیں ملنے لگیں۔ حتی کہ مادی چیز بھی اس کے لئے روحانی رزق کا ذریعہ بن جائے۔ ایمان کے اس اعلیٰ شعوری درجہ کو حاصل کرنے کے لئے ایک اور چیز بے حد ضروری ہے۔ اور وہ سادگی ہے۔ جو عورت یا مرد سادگی کو اپنا طریقہ نہ بنا سکے وہ دنیا کی مادی چیزوں میں گم رہے گا۔ وہ اللہ کی معرفت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔

مومن یا مومنہ وہ ہے جس کو ہر دوسری چیز سے زیادہ اللہ پر یقین ہو۔ جس کی دلچسپیوں کا مرکز اللہ کا دین بن جائے۔ جو دنیا سے زیادہ آخرت کا طالب ہو جائے۔ جس کا یہ حال ہو کہ جنت کا شوق اس کے ہر دوسرے شوق پر غالب آجائے۔

جس عورت یا مرد میں یہ ایمانی صفات پیدا ہو جائیں وہ تعریف اور تنقید سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ دنیوی کامیابی اس کو ناز میں مبتلا نہیں کرتی۔ کسی کا برا سلوک اس کے اندر انتقام کی نفسیات نہیں ابھارتا۔ ناکامی کا تجربہ اس کے اندر مایوسی پیدا نہیں کرتا۔ اس کا دل ہر ایک کی خیر خواہی سے بھر جاتا ہے۔ خواہ وہ اس کا اپنا ہو یا کوئی غیر۔ وہ اللہ میں جینے والا بن جاتا ہے نہ کہ غیر اللہ میں جینے والا۔

نئی دہلی، ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۰   دعاگو   وحیدالدین

ایک خط

برادر محترم جناب عبد السلام اکبانی صاحب　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۵ ستمبر ۲۰۰۰ کو ٹیلی فون پر گفتگو کے بعد یہ خط لکھ رہا ہوں۔ آپ نے ناگپور میں جو کام شروع کیا ہے وہ بہت اہم کام ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو زیادہ سے زیادہ مفید بنائے۔ آپ اپنے اس گروپ کا نام پازیٹیو تھنکرس فورم (Positive Thinkers' Forum) رکھیں۔ میرے خیال سے یہ زیادہ بہتر ہوگا۔

پازیٹیو تھنکنگ سے مراد ایجابی فکر یا مثبت فکر ہے۔ اس کا مطلب ہے مبنی بر حقیقت سوچ، ردّ عمل سے اوپر اٹھ کر غیر متاثر ذہن کے تحت سوچنا، ماحول سے آزاد ہو کر اپنی رائے قائم کرنا:

Positive thinking is—— thinking independent of circumstance.

یہ مثبت طرز فکر کسی انسان کی سب سے زیادہ اہم خصوصیت ہے۔ ذہنی ارتقاء اور عملی کامیابی کا سب سے زیادہ انحصار اسی صفت پر ہے۔

قرآن میں صبر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ قرآن کے مطابق، خسران سے بچنے کا واحد راز صبر ہے (العصر) اس کی وجہ یہ ہے کہ صبر کی روش ہی پازیٹیو تھنکنگ کی اصل بنیاد ہے۔ پازیٹیو تھنکنگ اپنی فطرت پر قائم رہنے سے حاصل ہوتی ہے، اور صبر اس بات کا ضامن ہے کہ آدمی کسی بھی حال میں اپنی فطرت سے ہٹنے نہ پائے۔

موجودہ دنیا میں ہر لحہ اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ آدمی منفی نفسیات کا شکار ہو جائے۔ کسی سے ناخوش گوار تجربہ ہو تو اس کے اندر غصہ کی آگ بھڑک اٹھے۔ کوئی شخص انا کو ٹھیس پہنچائے تو اس کے خلاف انتقام کی نفسیات بیدار ہو جائے۔ کسی کو اپنے سے بڑا دیکھے تو اس سے حسد کرنے لگے۔ کوئی تنقید کر دے تو اس کو ذلیل کرنے کے درپے ہو جائے۔ کسی سے توقعات پوری نہ ہوں تو اس کو برا سمجھنے لگے۔ کوئی نقصان پیش آئے تو مایوسی کا شکار ہو کر رہ جائے، وغیرہ۔

انہی جذبات کا نام منفی جذبات ہے اور کسی آدمی پر جب منفی جذبات طاری ہو جاتے ہیں

تو وہ اس کو اس کی اپنی فطرت سے ہٹادیتے ہیں۔اس کی عقل سلیم کام کرنے سے رک جاتی ہے۔ اس کی نظر محدودیت کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔

منفی ذہن کے دو سب سے بڑے نقصانات ہیں۔ایک یہ کہ اگر کوئی شخص آپ کے خلاف اشتعال انگیز بات کہے،اور آپ اس پر مشتعل ہو جائیں تو اس وقت آپ مذکورہ شخص کا طاقت ور جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے۔مشتعل انسان عین اپنے مزاج کے مطابق دل کی بھڑاس نکالنے والی باتیں بولنے لگتا ہے۔وہ سب وشتم کے جواب میں خود بھی سب وشتم کرنے لگتا ہے۔اس کے برعکس اگر اس کے اندر مثبت سوچ ہو تو وہ اپنے ذہن کی پوری صلاحیت کو استعمال کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے۔ وہ اس قابل ہوتا ہے کہ سب وشتم کا جواب دلائل اور حقائق کی زبان میں دے۔وہ ایسا طاقت ور جواب دے جس کے بعد خود اس کا حریف اپنے آپ کو غلط سمجھنے پر مجبور ہو جائے۔

یہی معاملہ عمل کا ہے۔ جس آدمی کے اندر منفی سوچ ہو وہ یہ کرتا ہے کہ جب کوئی صورت حال پیش آتی ہے تو وہ جوابی کارروائی کرنے کا منصوبہ بناتا ہے۔وہ اپنا منصوبہ اس ذہن کے تحت بناتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے مخالف کو مغلوب کر سکے۔اس کے برعکس جس آدمی کے اندر مثبت سوچ ہو وہ صرف جوابی کارروائی نہیں کرے گا بلکہ وہ پیش آمدہ صورت حال سے اوپر اٹھ کر وسیع تر حقائق کی روشنی میں اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے گا۔ وہ سارے حالات اور امکانات کا جائزہ لے کر اپنے عمل کا نقشہ بنائے گا نہ کہ محدود طور پر صرف حریف کے پیدا کردہ حالات کی روشنی میں زور آزمائی کرنے لگے۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا منصوبہ حقائق پر مبنی منصوبہ ہوگا،اور جو منصوبہ حقائق پر مبنی ہو اس کی کامیابی کو کوئی چیز روکنے والی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مثبت سوچ یا پازیٹیو تھنکنگ کسی انسان کے لئے فطرت کا عظیم تحفہ ہے۔ مثبت سوچ مسٹر مین کو مسٹر سپر مین بنادیتی ہے۔ منفی سوچ ہمیشہ منفی نتیجہ پیدا کرتی ہے،اور مثبت سوچ ہمیشہ مثبت نتیجہ۔

نئی دہلی، ۲۳ اکتوبر ۲۰۰۰ دعاگو وحیدالدین

ایک خط

برادر محترم جناب یوسف نورانی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۲۴ ستمبر ۲۰۰۰ کو ٹیلیفون پر آپ سے قرآن کی ایک آیت پر گفتگو ہوئی۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: وہی ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری، اس میں بعض آیتیں محکم ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں، اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔ پس جن کے دلوں میں ٹیڑھ (زیغ) ہے وہ متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں فتنہ کی تلاش میں اور اس کی تاویل کی تلاش میں۔ حالاں کہ اس کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور جو لوگ علم میں رسوخ رکھنے والے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ (آل عمران ۷)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ قرآن سر تاپا ہدایت کی کتاب ہے۔ مگر اس کتاب سے ہدایت اسی شخص کو ملے گی جو عقل صحیح کے ساتھ اس کو پڑھے۔ جو آدمی قرآن کو عقل صحیح کے ساتھ نہ پڑھے اس کو اس کتاب سے ہدایت نہیں مل سکتی۔

قرآن کو عقل صحیح کے ساتھ نہ پڑھنا کیا ہے، اس کو مذکورہ آیت میں زیغ کے لفظ میں بیان کیا گیا ہے۔ زیغ کے معنی عربی زبان میں انحراف (deviation) کے ہیں۔ عربی میں کہا جاتا ہے کہ زاغ عن الطریق، یعنی وہ سیدھے راستہ سے ہٹ گیا۔ گویا قرآن کو عقل صحیح کی روشنی میں پڑھا جائے تو اس سے ہدایت کی روشنی ملے گی۔ اور اگر قرآن کو منحرف ذہن کے تحت پڑھا جائے تو ایسے آدمی کے لئے قرآن ہدایت کا ذریعہ نہیں بنے گا۔ وہ صرف بھٹک کر رہ جائے گا۔

اس زیغ کی بعض عملی مثال لیجئے۔ مثلاً قرآن میں ید اللہ (المائدہ ۶۴) کا لفظ آیا ہے۔ یعنی اللہ کا ہاتھ۔ اب اگر کوئی شخص اس آیت کو لے کر اس بحث میں پڑ جائے کہ اللہ کا ہاتھ انسان کی طرح پانچ انگلیوں والا ہاتھ ہے یا اس سے مختلف ہے، تو یہ زیغ (انحراف) ہوگا۔ اس کے برعکس

اس مثال میں عقل صحیح یہ ہے کہ ید اللہ کو اللہ کی طاقت کے معنی میں لیا جائے نہ کہ انسانی ہاتھ جیسے ہاتھ کی معنی میں۔

اسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ہر انسان مر کر قبر میں دفن ہوگا اور پھر قیامت کے دن قبر سے نکالا جائے گا (العبس ۲۱۔۲۲) اب اگر ایک شخص اس آیت میں یہ بحث نکالے کہ دفن ہونے اور دوبارہ زندہ اٹھانے کے درمیان کتنے سال کا فاصلہ ہے تو یہ اصل کلام سے انحراف کی ایک مثال ہوگی جو آدمی کو ذہنی انتشار (کنفیوزن) کے سوا کہیں اور پہنچانے والی نہیں۔ اس کے برعکس اگر آدمی اس آیت سے یہ نصیحت لے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ موت کے بعد ہر انسان کو اللہ کے سامنے حساب کے لئے پیش ہونا ہے تو یہ گویا اس آیت کو عقل صحیح کی روشنی میں دیکھنا ہوگا جو آدمی کے لئے ہدایت کا ذریعہ بن جائے گا۔

اسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن آدمی سے اس کے رشتہ دار بھاگیں گے، حتی کہ اس کی بیوی بھی اور اس کے بچے بھی اس سے بھاگیں گے (العبس ۳۶)۔ اب اگر ایک شخص اس آیت کو پڑھ کر یہ بحث کرے کہ میری بیوی اس وقت کہاں ہے۔ میرے مرنے کے بعد وہ مجھ سے ملے گی یا نہیں۔ وہ مجھ سے بے حد محبت کرتی تھی پھر کیوں کر ایسا ہوگا کہ وہ مجھ کو چھوڑ کر مجھ سے بھاگنے لگے، تو یہ سب زیغ (انحراف) کی مثال ہوگی۔ اس کے برعکس، اس آیت کو عقل صحیح کے مطابق لینا یہ ہے کہ آدمی اس کو پڑھ کر سہم جائے اور یہ سوچنے لگے کہ قیامت کا دن کتنا ہولناک ہوگا کہ لوگ اپنی محبتیں بھول جائیں گے اور وہ رشتے ٹوٹ جائیں گے جن کو ہم دنیا میں بہت مضبوط سمجھتے تھے۔ جو آدمی اس طرح سوچے اس کے لئے یہ آیت ہدایت کا ذریعہ بن جائے گی۔

اسی طرح قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی ان کی راہ پر ایمان کے ساتھ چلی، ان کے ساتھ ہم ان کی اولاد کو بھی جمع کر دیں گے اور ان کے عمل میں سے کوئی چیز کم نہیں کریں گے۔ ہر آدمی اپنی کمائی میں پھنسا ہوا ہے۔ (الطّور ۲۱)۔ اس آیت میں اگر کوئی شخص یہ بحث نکالے کہ جب اللہ کو آخرت میں مجھ کو اور میری بیوی کو ایک ساتھ ملانا تھا تو

میری اور میری بیوی کی موت کا وقت ایک ہی کیوں نہیں رکھا گیا، ہم دونوں کی موت الگ الگ وقتوں میں کیوں مقدر کی گئی، تو یہ زیغ (انحراف) کی مثال ہوگی۔ اس کے برعکس اس آیت کو صحیح مزاج کے ساتھ لینا یہ ہے کہ آدمی خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ عمل صالح کرنے لگے تاکہ اس کے وفات یافتہ عزیز یا عزیزہ سے آخرت میں اس کی رفاقت یقینی ہو جائے۔

ان چند مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کی آیتوں سے صحیح مفہوم لینے کا مطلب، کیا ہے اور غلط مفہوم لینے کا مطلب کیا ہے اور یہ کہ کس طرح ایسا ہوتا ہے کہ قرآن کچھ لوگوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ بن جائے اور کچھ لوگوں کے لیے گمراہی کا۔

یہاں قرآن کی ایک اور آیت قابل حوالہ ہے۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: اور جو لوگ شیطان سے بچے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور وہ اللہ کی طرف رجوع ہوئے۔ ان کے لئے خوش خبری ہے، تو میرے بندوں کو خوش خبری دے دو جو بات کو غور سے سنتے ہیں۔ پھر وہ اس کے احسن کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی ہیں جو عقل والے ہیں (الزمر ۱۷۔۱۸)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن اگرچہ سرتاپا ہدایت ہے لیکن اگر کوئی آدمی شیطان کے بہکاوے میں آجائے تو وہ قرآن کی آیت سے غیر احسن مفہوم لے کر گمراہی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ بظاہر وہ قرآن کی ایک آیت کا حوالہ دے گا مگر وہ اپنے متاثر ذہن کی بنا پر اس آیت کا خود ساختہ مفہوم لے لے گا، اور گمراہی سے نکل نہ سکے گا۔

اس کے بجائے صحیح طریقہ یہ ہے کہ کلام کو نہایت توجہ کے ساتھ سنا جائے اور کھلے ذہن کے ساتھ غور کر کے صحیح رائے تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ جو لوگ یہ شرط پوری نہ کریں وہ بظاہر قرآن کی آیتیں پڑھیں گے مگر اس سے انہیں بھٹکنے کے سوا کچھ اور حاصل نہ ہوگا۔

۲۶ ستمبر ۲۰۰۰ دعا گو وحید الدین

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچہ ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 110	ایک سال	$ 20/ £10	$ 10/ £5
دو سال	Rs. 200	دو سال	$ 35/ £18	$ 18/ £8
تین سال	Rs. 300	تین سال	$ 50/ £25	$ 25/ £12
پانچ سال	Rs. 480	پانچ سال	$ 80/ £40	$ 40/ £18

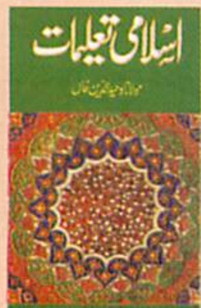
ISLAMIC BOOKS

Tell Me About Hajj *(with colour pictures)*	295/-
Tell Me About the Prophet Muhammad *(with colour pictures)*	345/-
Allah is Known Through Reason *(with colour pictures)*	345/-
The Miracle in the Ants *(with colour pictures)*	295/-
The Quran	245/-
The Quran: An Abiding Wonder	145
The Call of the Qur'an	95/-
The Koran	125/-
Heart of the Koran	195/-
The Soul of the Quran	125/-
Presenting the Quran	125/-
The Moral Values of the Quran	125/-
The Basic Concepts in the Quran	195/-
A Treasury of the Quran	75/-
The Quran for all Humanity	75/-
The Beautiful Commands of Allah	125/-
The Beautiful Promises of Allah	175/-
The Wonderful Universe of Allah	85/-
Muhammad: A Prophet for all Humanity	195/-
Muhammad: A Mercy to all the Nations	250/-
Words of the Prophet Muhammad	75/-
The Sayings of Muhammad	75/-
The Life of the Prophet Muhammad	75/-
Muhammad: The Hero as Prophet	75/-
History of the Prophet Muhammad	75/-
An Islamic Treasury of Virtues	195/-
A-Z Steps to Leadership	95/-

Islam and Peace	150/-
Introducing Islam	195/-
The Moral Vision	145/-
Principles of Islam	145/-
The Muslim Prayer Encyclopaedia	250/-
After Death, Life!	195/-
Living Islam: Treading the Path of Ideal	250/-
A Basic Dictionary of Islam	250/-
The Muslim Marriage Guide	250/-
The Essential Arabic	175/-
Indian Muslims	65/-
God Arises	125/-
Islam: The Voice of Human Nature	40/-
Islam: Creator of the Modern Age	70/-
Woman Between Islam and Western Society	145/-
Woman in Islamic Shari'ah	125/-
Islam As It Is	70/-
Religion And Science	45/-
Man Know Thyself	8/-
Muhammad: The Ideal Character	8/-
Tabligh Movement	40/-
Polygamy and Islam	7/-
Hijab in Islam	20/-
Concerning Divorce	7/-
The Way to Find God	25/-
The Teachings of Islam	50/-
The Good Life	45/-
The Garden of Paradise	45/-
The Fire of Hell	45/-
Islam and the Modern Man	25/-
Uniform Civil Code	10/-

Goodword BOOKS

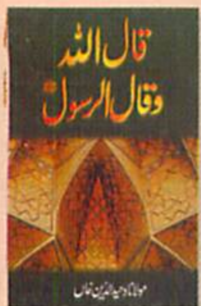
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 462 6666, 462 5454, 4611128
Fax: 469 7333, 464 7980 email: skhan@vsnl.com





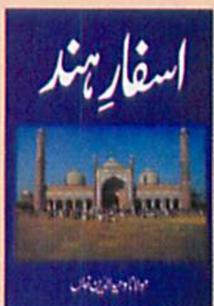






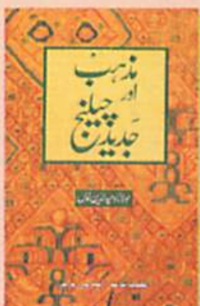




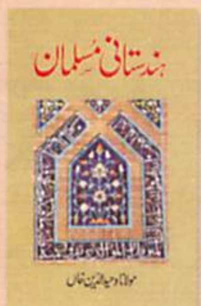




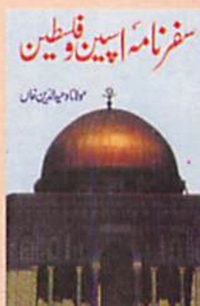


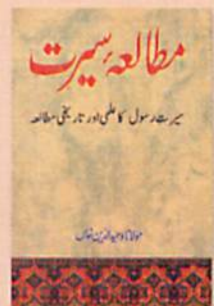












Delhi Postal Regd. No. DL/11154/2000

Al-Risāla 1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 462 6666, 462 5454, 4611128
Fax: 469 7333, 464 7980 email: skhan@vsnl.com